افسانوی مجموعہ

بند مُٹھی سے بھاگا پرندہ

شیخ بشیر احمد

ناشر: جموں کشمیر اُردو اکادمی سرینگر

معروف کالم نگار، ادیب، مدیر
برادرم سلیم سالک صاحب
کے لئے بے پناہ محبتوں کے ساتھ

شیخ بشیر احمد
۲۱ اگست ۲۰۱۲ء

افسانوی مجموعہ

بند مٹھی سے بھاگا پرندہ

مصنف

شیخ بشیر احمد

ٹینگہ پورہ نواب بازار سرینگر ۱۹۰۰۰۲ کشمیر

ناشر:۔ اُردو اکادمی جموں کشمیر سرینگر

نام کتاب: بند مٹھی سے بھاگا پرندہ

مصنف : شیخ بشیر احمد

کمپوزنگ: ایم، بشارت احمد بابا (چھتہ بل سرینگر)

سرورق : عادل مختار

مطبع :

صفحات : ۱۶۸

زمانہ : جنوری ۲۰۱۱ء

ناشر : اردو اکادمی جموں کشمیر سرینگر

قیمت : ۳۰۰ روپے

رابطہ: 09858989900, 0194-2104598

اس کتاب میں ظاہر کئے گئے کہانیوں کے کردار، واقعات اور مقامات فرضی ہیں۔ کسی بھی قسم کی مطابقت اتفاقیہ ہوگی۔

کتاب ملنے کا پتہ

۱۔ اردو اکادمی سرینگر

۲۔ المختار پبلی کیشنز نئی بستی اسلام آباد

۳۔ شیخ بشیر احمد ٹینگہ پورہ نواب بازار سرینگر

۴۔ میزان پبلی کیشنز بٹہ مالو سرینگر

انتساب

ان تمام درخشندہ ستاروں کے نام
جو میرے محور کے اردگرد گھومتے رہے
اور شام کے مٹیالے سے آنچل میں روپوش ہو گئے

اور

ان تمام درخشندہ ستاروں کے نام جن کے محور کے اردگرد
گھومتے ہوئے ایک دن مجھے بھی قوسِ قزح کی طرح
دھندلائی سی شام میں اوجھل ہونا ہے۔

فہرست

تاثر

ادیب براہ راست اپنے عہد کے مشاہدے سے ترغیب پا کر لکھتا ہے۔ کشمیر بیس بائیس سال سے جس پر آشوب دور سے گذر رہا ہے اُسے موضوع بنا کر شیخ بشیر احمد کے بیشتر افسانے نہ صرف انداز بیان سے متاثر اور متوجہ کرتے ہیں بلکہ کچھ سوچنے پر بھی مجبور کرتے ہیں۔

پروفیسر مخمور حسین بدخشی
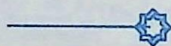
پیش لفظ

سب سے پہلے میں شیخ بشیر احمد کو اُن کے پہلے افسانوی مجموعے ......"بند مٹھی سے بھاگا پرندہ"......کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتا ہوں میرے خیال میں اُن کا افسانوی مجموعہ بہت پہلے شائع ہو جانا چاہیئے تھا، چلئے دیر آید درست آید کے نظریئے کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بتانا ضروری ہے کہ شیخ صاحب نے اپنے افسانوی سفر کا آغاز دسمبر ۱۹۶۹ء میں کیا۔ جب اُن کی تحریر کردہ کہانی "اور اُس نے اپنی موت کا جواز تلاش کرلیا" شہر سرینگر سے شائع ہونے والے اس زمانے کے ایک معروف اخبار "چنار" میں اُس برس ۹ دسمبر کو شائع ہوئی۔ اُن کی دوسری کہانی کا عنوان تھا "بوند جو بن گئی موتی" یہ کہانی بھی اخبار چنار میں ہی شائع ہوئی۔ کشمیر سے شائع ہونے والے ماہنامہ "نگینہ" میں بھی اُن کی دو ایک کہانیاں شائع ہوئیں اور اس کے بعد قریب قریب بیس سال تک طویل اور مسلسل خاموشی جس کے نتیجے میں کہانیوں سے بھرپور پرندہ مٹھی میں ہی بند رہا۔ مٹھی بند رکھنے کی دوسری وجہ شاید غم روزگار یا غم یاراں بھی ہو سکتی ہے۔ وہ شیخ صاحب ہی بہتر جانتے ہیں چلئے اس راز کو بھی راز ہی رہنے دیتے ہیں۔ مٹھی کھلنے لگی تو انہوں نے دوبارہ لکھنا شروع کیا لیکن بہت کم رفتاری سے اور پھر جب اردو اکادمی جموں کشمیر کی بنیاد پڑی اور شیخ صاحب نے ایک بنیادی ممبر کی حیثیت سے اکادمی کے امور میں دلچسپی لینا شروع کردی تو اُن کے اندر پوشیدہ پرندہ پَر پھڑ پھڑانے لگا اور اس طرح اُن کی بند مٹھی کا پرندہ بھاگ کر ہی رہا۔ کہانی کار کو ایک نئی راہ ملی، ایک نئی فضا، نئے دوست واحباب ملے، ادبی محفلوں اور ادبی تقریبوں میں شرکت کرنے کے نئے مواقع میسر ہوئے اور

اِس طرح اُن کے تجربات اور مشاہدات میں اضافہ ہوتا گیا۔ پرندہ بھاگتا رہا، نئی کہانیاں تخلیق ہوتی رہیں اور یہ کہانیاں مقامی اخبارات کے ساتھ ساتھ کشمیر اور بیرونِ کشمیر سے شائع ہونے والے جرائد میں شائع ہونے لگ گئیں۔ اس تعلق سے لفظ لفظ تحریک ادب، فنون، بے باک، شیرازہ اور ایوان اردو جیسے رسائل کا نام لیا جاسکتا ہے، کہانی قلم بند کرنے کا اُن کا سلسلہ اب باقاعدگی کے ساتھ جاری ہے

شیخ صاحب کے اس مجموعے میں ۲۳ کہانیاں شامل ہیں اور اُن کی یہ کہانیاں پڑھ کر آپ کو احساس ہوگا کہ وہ موجودہ دور کے سماجی، سیاسی اور اقتصادی مسائل اور معاشرتی حالات وحقائق کے حوالے سے اپنی کہانیوں کی بنیاد رکھتے ہیں اور اُن کا تانا بانا تعمیر کرتے ہیں اور اپنی کہانیوں میں زندگی کے مختلف تلخ شیرین رشتوں کی بات اپنے انداز اور اپنے لب و لہجے میں کرتے ہیں۔ وہ انسان زندگی کی تلخ سچائیوں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اِن تلخ سچائیوں کے پس منظر میں اُن کی زندگی کا بھرپور تجربہ نظر آتا ہے، اُن کے افسانوں میں شہری زندگی کے ساتھ ساتھ دیہی زندگی کی اَن گنت جھلکیاں بھی ملتی ہیں، وہ اپنے افسانوں میں اخلاقی اقدار کی عکاسی کرتے ہیں، اُن کے افسانوں کے کردار عام طور سے متوسط اور نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور کبھی کبھار وہ اپنے افسانوں کے ذریعہ کشمیر کے موجودہ پُر آشوب پُر درد اور غمناک دور کی عکاسی بھی اپنے ڈھنگ سے کرتے ہیں۔ اِن کے ہاں جنسیات کی زیادہ اُلجھنیں نہیں ہیں، وہ عشق ومحبت کی باتیں تو کرتے ہیں لیکن اپنے جذبات کو روک کر، اور اخلاقیات کا دامن سمیٹے ہوئے (اور اب شاید عمر کا بھی یہی تقاضا ہے)۔ بہر حال شیخ صاحب کا افسانوی مجموعہ آپ کے سامنے ہے، میں تو اپنی بات کہہ چکا ہوں، آپ بھی اپنے انداز سے اپنی بات کہہ سکتے ہی۔ آپ کی بات سُن کر مجھے خوشی ہوگی اور شیخ بشیر احمد کو بھی......!!! شکریہ!

سرینگر

۳۱ / دسمبر ۲۰۱۰ء —— نور شاہ

چند یادیں چند باتیں

شیخ بشیر احمد اب کافی دنوں سے اردو کہانیاں لکھ رہے ہیں اور ان کی کہانیاں متواتر کئی معیاری رسائل و جرائد میں بھی باقاعدگی کے ساتھ چھپتی رہتی ہیں۔ قارئین اردو ادب کے لئے ان کا نام جانا پہچانا نام ہے۔ مسلسل و متواتر چھپنے چھپانے سے کہانی تخلیق کرنے کا ان کا ہنر اور بھی نکھر اور سنور گیا ہے اور انہوں نے اسی خوبی اور خصوصیت کی بناء پر اپنے ہاں جمود طاری ہونے نہیں دیا۔ بلکہ کافی دنوں سے اپنے آپ کو مجموعی طور پر اردو میں تخلیق ہونے والے افسانوی ادب اور افسانہ نگاروں کے ساتھ جوڑ کے رکھا ہے اور اردو کہانی میں مختلف ادوار میں آنے والی خوشگوار اور صحت مند تبدیلیوں کو سمجھا اور محسوس کیا ہے اور انہیں برتا بھی ہے۔

پچھلی تین دہائیوں سے کشمیر میں تخلیق ہونے والی اردو کہانیوں اور افسانوی ادب پر اگر ایک طائرانہ نظر دوڑائی جائے تو ان میں اکثر کہانی کاروں نے کشمیر میں اس عرصے میں جاری رہنے والی سیاسی اتھل پتھل اور ابتر حالات کو ہی موضوع بحث یا اپنی کہانیوں کا پلاٹ بنایا ہے یہ بات بھی بجا ہے کہ ہر کہانی کار پہلے اس سماج کا ایک ذمہ دار فرد ہوتا ہے جس سماج میں وہ رہ رہا ہو پرورش پا رہا ہو۔ اسلئے اس سماج یا سوسائٹی میں رونما ہونے والے حالات و واقعات اسے بھی متاثر کرتے ہیں اور لامحالہ طور پر اس کی فکر و سوچ پر اثر انداز ہو جاتے ہیں۔

شیخ بشیر ان کہانی کاروں میں سے ہیں جو وقتی طور پر پیدا ہونے والے ہوا کے جھونکوں سے یا پھر موسمی تبدیلیوں سے اپنی ڈگر تبدیل نہیں کرتے بلکہ باد مخالف کے سامنے ڈٹ کر سبک رفتاری اور سکون و اطمینان کے ساتھ قدم بقدم منزل مقصود کی طرف گامزن رہتے ہیں۔

اوران کے ارادوں میں کوئی تبدیلی یہاں تک کہ ماتھے پر ذراسی شکن بھی نہیں آجاتی۔

کشمیر کے موجودہ اردو کہانی کاروں کے قبیلے میں ایسے دو ایک افسانہ نگار ہیں جو ہر حال میں اپنے موضوع سے ہٹ کر ادھر اُدھر نہیں دیکھتے بلکہ بہر صورت اپنے ہی خیالوں میں مگن دیکھے جاسکتے ہیں۔اس کا مطلب یہ نہیں نکالا جانا چاہیئے کہ وہ کسی طرح سے ہٹ دھرم ہیں انھوں نے اپنے اسی رنگ میں اچھی اچھی اور خوبصورت کہانیاں تخلیق کی ہیں اور کر رہے ہیں۔شیخ بشیر احمد بھی انہی کے کہانی کاروں میں سے ایک کہانی کار ہیں۔

شیخ بشیر احمد کی کہانیوں میں کئی خوبیاں ہیں پلاٹ پر اچھی خاصی گرفت،مناسب الفاظ کا استعمال،کرداروں سے نپے تلے مکالموں کی ادائیگی کروانا،حالات و واقعات میں ایک خوشگوار تسلسل برقرار رکھنا وغیرہ ان کو اچھی طرح سے آتا ہے۔جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ بشیر اردو کہانی کے مزاج سے بخوبی واقف ہیں۔

شیخ بشیر احمد کے زیر نظر افسانوں مجموعے میں شامل افسانے اُن کے اب تک کے تخلیق کردہ افسانوں کا انتخاب ہے۔انہوں ابتدا سے جو افسانے تخلیق کئے ہیں اور جو مختلف رسائل وجرائد میں چھپے ہیں۔ان کا دوسرا کیلکشن Collection بھی تقریباً اُنکے پاس تیار پڑا ہے۔جس سے وہ جلدہ زیور طبع سے آراستہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔یہ وضاحت اسلئے بھی ضروری تھی کہ قارئین یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ ایک لمبے عرصے پر محیط اُنکی افسانہ نویسی کی بساط صرف اِن چند ایک افسانوں پر ہی پھیلی ہوئی ہے۔

وہ لکھ رہے ہیں اور سرگرمی سے لکھ رہے ہیں۔

یہ بات باعث مسرت ہے کہ شیخ بشیر اپنا پہلا افسانوں کا مجموعہ چھاپ رہے ہیں۔ امید ہے ادبی حلقوں میں ان کی اس کوشش کو سراہا جائے گا اور اسکی پذیرائی کی جائے گی۔

والسلام

ڈاکٹر اشرف آثاری

احساسات

بلاشبہ وادی کشمیر کی دلفریب خوبصورتی دل کو مسحور کر دیتی ہے۔ یہاں کے اونچے اونچے بلند قامت سفید چاندی جیسے برف پوش کوہساروں، مرغزاروں، کھیتوں، ہرے بھرے سبزہ زاروں و باغوں دلکش۔ منظر اپنی بہار دکھاتے نظر آتے ہیں۔ روح فرسا معطر کر دینے والی ہواؤں کے خوشگوار ماحول کو دیکھنے سے پتہ لگ جاتا ہے کہ واقعی یہ حسین وادی کسی زمانے میں صوفی سنتوں، سادھو، فقیروں، اولیاء اور خدا شناس بزرگوں کی مسکن رہی ہوگی اور سالہا سال سے امیروں، مہاراجاؤں، نوابوں اور بادشاہوں نے بھی تفریح کا کام لیا ہے۔

تاریخ کی کتابوں کا مطالعہ کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ یہ دلفریب وادی جسے جنت کا گوشہ کہا جاتا ہے پرانے زمانے کا علم اور ریاضت کا گہوارہ رہا ہے۔

پچھلے ساٹھ ستر سالوں کا زمانہ اظہر من الشمس ہے۔ اردو ادبی دنیا میں جن بے شمار ہستیوں نے برصغیر ہند و پاک کے علاوہ ساری دنیا میں اپنی فنی صلاحیت اور آفاقیت کی چھاپ ڈالی ہے اور اس میدان میں بڑی جرأت مندی سے اپنا حق کما حقہ حاصل کیا ہے۔ ان میں اکثر ادیبوں کا تعلق اس سرزمین اور تہذیب سے جڑا ہے۔

پچھلی کئی دہائیوں سے ایک اور نئی نسل دیکھنے کو مل رہی ہے اور ان کی محنت و ریاضت اور ذوق و شوق اور لگن سے لبریز برجستہ تخلیقات منظر عام پر آنے کی ایک خوش آئندہ علامت ہے۔ جو آہستہ آہستہ اردو دنیا میں اپنا مقام بنا رہی ہے۔ ان میں شیخ بشیر احمد کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ ان کا پہلا افسانوں کا مجموعہ 'بند مٹھی سے بھاگا پرندہ' کی صورت میں چھپ

جانا ان کی ادب دوستی کا واضح ثبوت ہے اور ابھی تک افسانوی سفر جوش وخروش کے ساتھ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ گویا۔

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار
خبر کرو میرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

ایک مختصر عرصے سے موقر اخبار ہند "سماچار" میں چھپتے رہتے ہیں۔ انہوں نے کم وقت میں جتنا لکھا ہے اتنا شاید ہی وادی کے کسی دوسرے افسانہ نگار نے لکھا ہو۔ علاوہ ازیں وہ ملک کے دوسرے نامور اور چھوٹے بڑے رسالوں میں چھپتے نظر آتے ہیں۔ جہاں تک ان کے لکھنے کا تعلق ہے ایسا لگتا ہے کہ وہ محض وقت گزاری اور شہرت کے لئے نہیں لکھتے ہیں۔ مگر انہوں نے آج تک جو کچھ لکھا ہے روزمرہ زندگی کی جھلک یہاں کی موجودہ سماجی وسیاسی دنیا میں نابرابری غیر تسلی بخش معاشی اقتصادی حالات وواقعات کو سیاق وسباق میں دیکھتے ہیں۔ پھر انہیں اپنے مخصوص انداز میں فنکارانہ انداز اور چابکدستی سے افسانہ، کہانی اظہار کو ذریعہ بنایا ہے۔ جس کا اثر ادبی وشائقین کے دل وذہن پر بہت دیر تک قائم رہتا ہے۔ ان باتوں کا علم اس وقت ہوتا ہے جب ادارے کو قارئین کے متواتر ڈھیر ساری تعریف کے خطوط وفون آتے ہیں۔

زیر نظر کتاب میں لگ بھگ ڈیڑھ درجن سے زائد افسانے شامل کئے گئے ہیں۔ جن میں بیشتر موقر اخبار ہند سماچار میں چھپ چکے ہیں۔ البتہ ان میں چند افسانے ملک کی دوسری ریاستوں کے نامور رسالوں میں بھی اشاعت پذیر ہوئے ہیں۔

یوں تو اس مجموعہ میں بہت سی اہم کہانیاں ہیں اور ان کے موضوع پر گفتگو کی جا سکتی ہے چونکہ یہ مجموعہ ان کی جدوجہد کا آغاز ہے۔ جو انہوں نے مختلف موضوعات پر تجربہ کیا ہے۔ لہٰذا انفرادی یا اجتماعی بنیادوں پر تبصرہ کرنا لامحالہ ہے۔

مجموعہ ہیں شامل پوری کہانیوں میں زیادہ تر کشمیری تہذیب وتمدن کی عکاسی کی گئی ہے۔ ساتھ ہی ملک کے بڑے بڑے مسائل جیسے بھوک، غربت، جہالت، دہشت گردی،

بے روزگاری و بیکاری، مہنگائی اور شادی و بیاہ کی رسم بد۔ غرض زندگی سے متعلق ہر شعبے اور ہر مسئلے پر چھوٹے بڑے موضوعات کے اردگرد گھوم رہے ہیں۔ معاشرے کی کمزوریوں کی رونمائی کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا ہے۔

مجموعہ کی لگ بھگ تمام کہانیوں سے یہ بات تو ظاہر ہے کہ ان میں پلاٹ تاثیر انگیزی مکالمہ، کردار، بیانیہ، واقعہ نگاری، منظر نگاری، حقیقت پسندی، گہری فکر، نقطہ عروج اور اختتامیہ وغیرہ جو ایک اچھے افسانہ یا کہانی کے لئے ضروری ہیں۔ انتہائی سادہ اور سلیس زبان اور موثر انداز میں شیخ بشیر احمد پیش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ واقعی یہ کتاب ادبی دنیا میں ایک خوشگوار اضافہ ہے اور افسانے کی اپنی حیثیت رکھتی ہے۔ اہل نظر کو دعوت دیتی ہے۔ شاید قارئین اور ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس کی پذیرائی اور بھرپور داد دیں گے۔ کاغذ، گٹ اَپ خوبصورت ہے۔ اور قیمت بھی معقول ہے۔

روشن لال سینی

سینئر سب ایڈیٹر روزنامہ "ہند سماچار" جالندھر

اپنی بات

یہ بات میرے لئے باعثِ مسرت ہے کہ میرے والد صاحب نے اپنا اوّلین افسانوں کا مجموعہ "بند مٹھی سے بھاگا پرندہ" چھاپنے کا ارادہ کرلیا ہے چونکہ وہ اپنے آس پاس علاقے، برادری اور خاندان میں پہلے شخص ہیں جنہوں نے اُردو ادبی دنیا میں اپنی شناخت قائم کرلی ہے۔

گویا ان کی ذاتی زندگی سے متعلق خود ان کا ماضی آئینہ ہے البتہ جو چند باتیں میری معلومات میں ہیں۔ میں انہیں من و عن اختصار کے ساتھ پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ میرے والد صاحب کی یوم پیدائش ۹/مارچ ۱۹۵۰ء شہر کے پائین علاقے کے ایک محلّہ میں ہوئی جہاں اسوقت ہم سکونت پذیر ہیں۔

جب وہ تقریباً پندرہ، سولہ سال کے تھے۔ انکے والد بزرگوار محمد رمضان لگ بھگ ساٹھ سال کی عمر میں وفات پا گئے اِس بنا پر وہ اپنی تعلیم مزید جاری نہ رکھ سکے۔ محکمہ تعلیم کے ایڈمنیٹریشن شعبہ میں بحثییت جونیئر کلرک کے منازل طے کرتے ہیڈ اسسٹنٹ کے عہدے پر سال ۲۰۰۸ء میں باعزت سبکدوش ہوگئے۔

جب سے میں نے ہوش سنبھالا تو میں نے انہیں ہمیشہ اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے کتابوں کا مطالعہ کرتے یا لکھتے میں مصروف پایا۔ گھر میں ہر مہینے بے شمار رسائل اور اخبارات آنے سے مطالعہ کرنے کا مجھے بھی موقع ملتا ہے خصوصاً جب انکے افسانے چھپ جانے کے بعد ان پر سیر حاصل تبصرہ کیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے میری ذاتی رائے ہے کہ انکے افسانے شبنم کی طرح شفاف اور خوشبو کی طرح تر و تازہ ہیں۔ اُن میں کسی قسم کی بناوٹی، تشہیری یا اساطیری عمل کا کوئی دخل نہیں جبکہ وہ سب ذاتی مشاہدے و تجربات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ جن سے زبان و بیان میں سادگی اور حقیقت پسندی صاف جھلکتی ہے۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں اکثر اپنے گرد و پیش ماحول میں نشو و نما پا رہی، خرابیوں، بدعتوں اور سماجی قدروں کی تذلیل، لوٹ کھسوٹ، رشوت خوری جیسی سماجی و معاشرتی برائیوں کو موضوع بنایا ہے جنہیں ہم دیکھنے سمجھنے کی استطاعت رکھنے کے باوجود بھی نظر انداز کر کے مسرت اور تسکین حاصل کرتے ہیں جیسے ان سب باتوں سے چنداں تعلق نہیں۔

انہوں نے کئی انعامات اور اعزازات بھی حاصل کئے اور کئی ادبی تنظیموں کے رکن بھی رہے۔

اُمید ہے اُردو ادب کے شائقین انکی حوصلہ پریزائی فرمائیں گے۔ شکریہ

ڈاکٹر شیخ شعیب نثار

28-1-2011

من آنم کہ من دانم

ہر دور کی کچھ اپنی ترجیہات ہوا کرتی ہیں جن کی بنیاد پر تخلیق وجود میں آجاتی ہے۔
ایک تخلیق کار کا فن ارتقاء پذیر ہوتا ہے۔ وہ اپنی تیسری آنکھ کی مدد سے حالات کا مشاہدہ کر کے اور واقعات کو سمجھتے ہی ضبط تحریر میں لاکر انہیں صفحہ قرطاس پر پھیلا دیتا ہے یہ تیسری آنکھ در حقیقت اسکی تخلیق کی تیسری آنکھ ہوتی ہے، جس سے وہ ہمیشہ دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کرتا رہتا ہے اس بات سے انحراف نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ایک تخلیق کار اعلیٰ قدروں کا امین ہوتا ہے۔ معاشیات، سماجیات اور اقتصادات کی صحت مند روایتوں کا بھی پاسدار ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف اپنے دُور کا آئینہ دار ہوتا ہے بلکہ ایک تاریخ ساز بھی ہوتا ہے۔

اس حوالے سے میرے اس جذبہ اُمنگ، تجرباتی عمل اور محسوسات اظہار کرنے کے پیچھے جو مقصد کار فرما ہے۔ وہ اپنی سرزمین اور تہذیب وسماج اور معاشرے سے جڑے مسائل کے انبار کا محاسبہ کرنا ہے۔ زندگی کے تجربات ومشاہدات اور حالات وواقعات کو جس زاویہ نظر سے دیکھا اور محسوس کیا۔ انہیں اسی سیاق وسباق میں افسانوں کا روپ دیا ہے۔

مجھے اس بات کا اعتراف ہے۔ اس افسانوں کے مجموعہ "بند مٹھی سے بھاگا پرندہ" میں شاید وہ محاسن موجود نہ ہوں. اور نہ اس کی ترکیب وترتیب کی جمال آفرینی کی صفت کو حلاوت کی تعریف میں مکمل ہی سمجھا جاسکتا ہے۔ جو ایک اچھے اور ممتاز مجموعے کے گنوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ افسانے فکشن نگاری میں تکنیکی لحاظ سے قد وقامت اور قدر وقیمت کے تعین کے ضمن میں معیار پر پورے نہیں اترتے ہوں۔ گزارش ہے کہ ایک ادیب کی پہلی کاوش کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے تاثرات سے نوازا جائے۔ وہ بھی برائے تنقید کے لئے نہیں

بلکہ اس میں حوصلہ افزائی اور کچھ سیکھنے سکھانے کا جذبہ اور خلوص ہونا چاہیئے۔

مجھے اچھی طرح سے یاد نہیں کہ کب مجھے میرے اندر لکھنے کے جذبہ شوق نے قلم اٹھانے پر اُکسایا اور کب میں نے لکھنے کا آغاز کیا۔ البتہ جہاں تک میرا اندازہ ہے۔ آج سے برسوں پہلے جب اسرائیلی جارحیت کے خلاف پہلی مسلمان خاتون پائیلٹ لیلیٰ خالد نامی دوشیزہ نے ہوائی جہاز کو خودکش بم دھماکے سے اڑادیا تھا۔ اس عالم گیر شہرت پانے والی مجاہدہ پر میرا ایک مختصر مضمون موقر روزنامہ ''ھمدرد'' میں آیا تھا۔ پھر دوسرا مضمون جو تخلیلی انٹرویو لیلی خالد سے تھا سرینگر کے ایک مشہور جریدہ ''نگینہ'' میں چھپا تھا۔

میرے ادبی سفر کی ابتداء 1969 میں ہوئی۔ جب سرینگر کے ایک مشہور روزنامہ اخبار ''چنار'' میں پہلی بار میری کہانی (بشیر احمد بشیر کے نام سے) 9/دسمبر 1969 کے شمارے میں ''اور اس نے اپنی موت کا جواز تلاش کرلیا'' شائع ہوئی پھر دوسری کہانی اسی اخبار میں ''بوند جو بن گئی موتی'' کے عنوان سے چھپی۔ ان دنوں یہ اخبار مرحوم اسرار احمد آزاد کی ادارت میں چھپ رہا تھا۔ ایک عرصے تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ وادی کے اخباروں اور رسالوں کے علاوہ بیرونی جریدوں میں چھپ جانا میرے لئے خوش آئندہ مستقبل کی ضمانت تھی۔ ایک اچھا قلم کار بننے کی خواہش میں مجھے کتنی اذیتیں اٹھانی پڑی کہ انہیں ایک ایک کر کے شمار کرنا محال ہے۔

سال 1988ء میں ساری وادی پُر آشوب آندھی کی لپیٹ میں آگئی۔ یاس و غم اور بے چینی، بے قراری کا احساس میرے روم روم میں مرتعش تھا۔ آہستہ آہستہ لکھنے کا جذبہ ناپید ہوگیا۔ باہر کے رسائل اور اخبارات کا یہاں آنا جانا بند ہوگیا تھا۔ وادی کے اخباروں میں روز روز ہلاکتوں دھماکوں، خون ریزی اور تشدد آمیز واقعات کی خبروں سے لوگ دل برداشتہ ہو رہے تھے۔ یہاں کے لگ بھگ تمام ادیبوں نے اپنا ہاتھ لکھنے سے کھینچ لیا تھا۔ دوسری جانب چونکہ میں پہلے ہی سے زندگی کی آرائشوں، آسائشوں اور آزمائشوں کے گھیراؤ میں آگیا تھا۔ اس لئے میں نے بھی صورتحال دیکھ کر اپنا دامن چھڑا لیا۔

چونکہ کشمیر کے اردو زبان وادب میں وادی کے ابھرتے قلمکاروں کی تاریخ کے مختلف الجہات کارناموں سے بے کنارہ و بے بسیط نہیں ہوں۔ 1970ء سے 1988ء تک یہاں اردو کے لگ بھگ چالیس اُبھرتے قلمکار اپنی تخلیقی صلاحیتیں لے کر میدان میں اترے اور تخلیقی زور آزمائی کرنے میں مصروف ہو گئے۔ گویا یہ ایک ایسا زمانہ تھا۔ جب وادی میں نوجوان قلمکاروں کا ایک لشکر ہوا کرتا تھا۔ لیکن بعد ازاں 1988 سے 2006ء تک پورے پندرہ سال کے عرصے میں وادی کے حالات اتنے خراب رہے کہ لوگوں کو ہمیشہ اپنے سروں پر موت کا سایہ منڈلاتا دکھائی دیتا تھا اور بہت سے اسکے شکار بھی ہوئے۔ جس کے نتیجے میں حالات نے ایسا پلٹا کھالیا۔ وقت کے تھپیڑوں اور کئی مسائل کی بھرمار نے انہیں کشمکش زندگی میں اسطرح الجھا دیا کہ لکھنے کا رجحان اور دلچسپی کا جھرنا سوکھ گیا۔ ان میں بیشتر لکھاری یا پھر گوشہ نشیں ہوئے یا تو حالات کی ناسازی کے سبب خاموشی کے سمندر میں غرق ہو گئے۔

2006ء کی بات ہے وادی کے کئی قلمکاروں نے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر ایک ادبی تنظیم ''اردو اکادمی'' کا قیام عمل میں لایا۔ اس تنظیم میں کئی بزرگ اور کہنہ مشق ادیبوں نے شرکت کر کے اُسے فعال بنانے پر زور دیا۔ اور زبان وادب کی ترقی و ترویج اور نو آموز قلمکاروں کی حوصلہ افزائی کرنا اپنا بنیادی منشور قرار دیا۔

نجانے کونسی روشنی قوس قزح کی صورت میں میرے اندر سرائیت کر گئی کہ ایک نئی حرارت آ گئی اور سارا جمود ٹوٹ جاتے ہی یخ بستہ منجمد برف کا تودا پگھلتا گیا اور مجھے باقاعدہ لکھنے پر آمادہ کر لیا۔ افسانہ لکھنا فقط میرا جذبہ شوق رہا ہے۔ میں نے اسے کبھی پیشہ کے طور پر نہیں اپنایا ہے اور نہ ہی کوئی تفریح کی شے کے طور پر اپنی نگاہوں سے دیکھا ہے۔ اس لحاظ سے اگر اس سے زندگی کی آلائشوں اور کثافتوں سے دور رہنے کا ایک خوبصورت وسیلہ اور ذریعہ سمجھا جائے تو یہ تزکیہ نفس کے لئے بھی ایک بہترین نسخہ اور مداوا ثابت ہو سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ انسانیت کے خلاف جبر و احتساب اور سماج کی برائیوں اور بدعتوں کے خلاف قلم اٹھانا کار

ثواب سے کم نہیں۔ اپنا فریضہ انجام دینے میں سقراط کی طرح زہر کا پیالہ پینا گوارہ کرنا پڑتا ہے وگرنہ ایک تخلیق کار ایک عام آدمی سے کیسے اور کیونکر اپنی پہچان اور شناخت الگ ظاہر کرسکتا ہے۔

کچھ بھی ہو، دنیا کے لوگ مل کر اسے دماغی اختراع یا آوارگی کی علامت سمجھ لیں لیکن میں اسکے بغیر اپنا ادبی مقصد نامکمل سمجھتا ہوں۔

اس سلسلے میں جناب احمد کلیم فیض پوری کا مرہون منت ہوں جنہوں نے اپنے نوازش نامے کی وساطت سے میری حوصلہ افزائی کی اور میری ہر بار لکھنے کی تحریک وترغیب کو مزید تقویت بخشتے رہے اور مجھے دوبارہ ادبی میدان میں اتار کر خوش آئندہ مستقبل کا یقین دلاتے رہے۔

میں جناب پروفیسر مخمور حسین بدخشی کا احسان مند ہوں۔ جنہوں نے اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود اس افسانوی مجموعہ کو آخری مرحلے تک پہچانے میں بھرپور تعاون دیا ہے اور جناب مظفر ایرج کا بھی تہہ دل سے مشکور ہوں جنہوں نے ہمیشہ اپنا کتب خانہ میرے لئے وقف رکھا ہے۔ آخر پر ریاستی اردو اکادمی کا شکرگزار ہوں جنہوں نے اس مجموعہ کو چھاپ کر میری حوصلہ افزائی کی۔

اس دوران میں نے لگ بھگ چالیس کے قریب افسانے لکھے جن میں سے پندرہ سولہ افسانوں کا انتخاب کر کے اس مجموعے "بند مٹھی سے بھاگا پرندہ" میں شامل کرلیا۔ انشاءاللہ تعالیٰ دوسرا افسانوی مجموعہ "شیشے کی دیوار" عنقریب ہی چھاپنے کا ارادہ ہے۔ البتہ شائقین ادب کی زریں آرا اور تاثرات کا انتظار رہے گا۔

میرے کئی افسانے یا مضامین جن جریدوں اور اخباروں میں چھپ چکے ہیں

اخباروں کے چند نام اسطرح ہیں۔

"چنار"۔ "آفتاب"۔ "ھمدرد"۔ "پولیٹکل ٹائمز"۔ "سرینگر ٹائمز"۔ "نوائے صبح"۔

''زمیندار'' ''کشمیر عظمیٰ اور راشٹریہ سہارا وغیرہ۔

ہفتہ وار اخباروں میں: ''ترجمان الحق''۔ ''اذان''۔ ''نیا ولولہ''۔ ''آزاد ہند کلکتہ اور پکار

''قومی وقار'' عالمی سہارا'' قابل ذکر ہیں۔

چند ادبی رسالوں کے نام یوں ہیں۔

''ماہنامہ تحفظ''۔ ''گلفشاں''۔ ''فلمی ستارے'' ''خاتون مشرق'' ''شہر نگاراں'' ''بڑھتے قدم'' ''روشی'' ''نگار''۔ ''نگینہ'' ''الحیات'' ''انشا'' ''بے باک'' ''حکیم الامت''۔ ''ایوان اردو''۔ ''لفظ لفظ''۔ ''صدا''۔ تحریک ادب''۔ ''کسوٹی جدید''۔ ''آجکل''۔ ''شاندار'' ادبی گزٹ ''انتساب'' قرطاس'' رنگ'' گونج اور ایک تاریخ ساز ادبی مجلّہ ''ارمغان کاشمیر'' ہیں۔

اعزازات وانعامات:

۱۔ سال ۷۷۔۱۹۷۶، ادارہ قیصر الادب آگرہ یوپی کے زیر اہتمام کل ہند افسانوں کے تحریری مقابلہ جاتی امتحان میں بہترین افسانے پر توصیفی سند۔

۲۔ بزم شعراء اور آل انڈیا ہندی اردو سنگم جموں و کشمیر سرینگر کی جانب سے غیر معمولی ادبی خدمات پر توصیفی سرٹیفکیٹ۔

۳۔ راجیو گاندھی فاونڈیشن نئی دہلی کے اشتراک ہلپ فاونڈیشن شہجار جموں و کشمیر سرینگر کی جانب سے 2008-2009 کے زیر اہتمام افسانوں کے مقابلہ جاتی امتحان میں بہترین کہانی لکھنے پر ایک توصیفی سند کے ساتھ نقدی انعامی رقم ساڑھے سات ہزار روپے

جن ادبی تنظیموں میں رکنیت حاصل کی ان کے نام یوں ہیں۔

بزم شعراء۔ ممبر، بزم ادب۔ سیکریٹری، ~~سفینہ ادب~~۔ جنرل سیکریٹری، تلاش ادب۔ آرگنائزر اردو اکادمی، خازن۔

فی امان اللہ

شیخ بشیر احمد

اللہ اکبر......اللہ اکبر۔

نماز فجر کی اذان مسجد شریف کے سب سے اُونچے مینار پر لگے لاؤڈ سپیکر سے سنائی دی۔

یک لخت اُس کے چہرے سے مایوسی اور دہشت غائب ہوئی۔ آواز میں قدرت کا عجیب وغریب کرشمہ پایا کہ بڑی آسانی سے سب خوف جاتا رہا۔ تب ہی اس خیال نے اُسے یاس وغم کے تاریک غار سے باہر اُچھال دیا۔ اُس وقت آواز بالکل صاف سنائی دی تھی۔ ورنہ اس طرح اتنی دور سے دن کے اُجالے میں بالکل پراگندہ اور کثافت بھرے ماحول میں سنائی دینا کافی مشکل تھا۔

وہ بستر پر لیٹا لیٹا چھت کو تکتا جارہا تھا۔ یہاں تک کہ موذن کے آخری دعائیہ کلمات سے اذان کی تکمیل ہوئی۔ پھر بھی سارا ماحول بدستور تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ کافی دیر سے بے چینی اور اضطرابی کیفیت میں کروٹیں بدلتا رہا۔ اور بے سدھ پڑا ساری تدبیریں سوچتا رہا۔ لیکن ناکام رہا۔ جیسے نیند نے پلکوں پر نہ آنے کی قسم کھالی ہو۔ ویسے وہ آدھی رات تک نیند ہی میں تھا۔ اچانک گولی چلنے کی آواز سنائی دی تو ذہن میں اُتھل پتھل مچ گئی۔ ہڑبڑا کر اُس نے گردن گھمائی اس کی متجسس آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے سے عاجز تھیں۔ دونوں کان کھڑے ہوگئے۔ سمت کا کوئی اندازہ نہ ہوا۔ صرف آواز کو قریب کے فاصلے پر محسوس کیا۔

وہ لرز اُٹھا خوف اور ڈر سے اس کی بے قراری بڑھتی رہی۔ گرم گرم لحاف کے

باوجود سارے جسم کو ایک سرد لہر چھو کر گذر گئی۔

باہر کتوں کے بار بار بھونکنے سے سارا ماحول پراسرار بنا ہوا تھا۔ جیسے قبرستان کے باہر کی تمام جناتی قوتیں بھاگ کر ساری بستی میں وارد ہوئی ہوں۔

''کیا ہوا''؟ تشویش بھری آواز کسی گڈھے سے آتی ہوئی سنائی دی۔

''کچھ نہیں ٹھنڈ لگی ہے۔''

''لگتا ہے کہیں گولی چلی ہے۔'' دوبارہ وہی کانپتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''کیا پتہ کہاں چلی۔ تم سو جاؤ'' اُس نے دِلاسہ دیا۔

''ہاں ہاں مجھے نیند آرہی ہے''۔ تم بھی سو جاؤ ورنہ بچے جاگ جائیں گے۔''

''ہاں کوشش کرتا ہوں۔''

کمرے میں آوازیں اتنی مدھم پڑ گئیں کہ خاموشیاں مزید گہری ہو گئیں۔

گولی چلنے سے اُس وقت اُسے کوئی تعجب نہ ہوا۔ ڈر تو اس بات کا تھا۔ کہ باقی آدھی رات کیسے اضطرابی کیفیت میں کاٹے۔ اس سوچ نے اُسے مایوس اور نڈھال بنا دیا۔

رات کے آخری پہر کی بجائے دن میں کہیں بھی بے وقت دھماکہ ہوتا۔ گولی چلتی تو وہ چونکتے ضرور، ناگواری بھی ہوتی۔ تھوڑی دیر کھٹکا بھی رہتا پھر حالت خود بخود سدھر جاتی۔ لیکن اس وقت خلاف توقع آواز نے سارا سکون تتر بتر کر دیا۔

اُن دونوں نے بستر کے اندر دبک کر اپنے سروں کے اوپر لحاف سرکا دیا تھا اور فجر کی اذان کا انتظار کرنے لگے۔

اب جو موذن نے اذان دی تو اس کا چہرہ کھِل اُٹھا۔

''نماز کا وقت ہے اب اس طرح لیٹے رہنا اچھا نہیں۔'' وہ خود سے باتیں کرتا رہا۔ نماز کا ارادہ کیا۔ تکیے کے نیچے ہاتھ ڈال کر ٹارچ نکالی۔ کمرے میں موم بتی روشن ہوئی تو آہستہ آہستہ دروازہ کھلا۔

اتنے سویرے کہاں جانے کا اِرادہ ہے؟'' بستر میں لیٹے لیٹے ریحانہ نے سوال کیا۔
بھئی اذان ہو چکی ہے۔ جا رہا ہوں اپنا خیال رکھنا۔''
وہ باہر نکلا۔ تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا مسجد شریف کی جانب چل پڑا۔
ساری فضا خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھی ۔ اب نمازیوں کے قدموں کی آہٹ سے خاموشی ٹوٹ رہی تھی۔ راستے میں آوارہ کتے کہیں دکھائی نہ دیئے۔
نماز سے فارغ ہو کر مسجد شریف سے باہر نکلا اور اُسی راستے سے اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ اگلے موڈ پر سامنے دو مشتبہ آدمی دوڑتے ہانپتے پاس ہی ایک تنگ گلی میں جا گھسے۔ اشتیاق بڑھا۔ گلی میں جھانک کر دیکھا تو گلی کے درمیان چند آدمی کھڑے تھے۔ اور آگے فرش پر خون سے لت پت سر کٹی لاش پڑی ہوئی تھی۔ دو گز کی دوری پر سر بھی پڑا ہوا تھا۔ آنکھیں رحم کی درخواست کرتے ہوئے پتھرا گئی تھیں۔ دونوں جگہوں پر خون کی پتلی سی دھار بہہ چکی تھی۔ سفید قمیض خون سے لال ہو چکی تھی۔ خاکی پتلون پر خون کے دھبے تھے۔
اتنا بھیانک منظر پایا تو وہ خوف اور نفرت سے سر سے پاؤں تک پسینہ پسینہ ہو گیا۔ پاس ہی کھڑے آدمی ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھتے جا رہے تھے۔ انکے چہروں پر پژمردگی چھائی ہوئی تھی۔ آنکھوں سے نفرت کے شعلے اُمڈتے ہوئے ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کے اندر سوکھی لکڑی نے آگ پکڑ لی ہو۔
اسی اثناء میں اڑوس پڑوس میں سے کسی نے لاش کے اوپر ایک پرانی میلی کمبل پھیلا دی۔ اب لوگوں کی بھیڑ بڑھ رہی تھی۔ ہر آگے دیکھنے والا پیچھے کھسک جاتا اور پیچھے کا آدمی اُس کی جگہ لیتا ہوا لاش کو پہچاننے کی کوشش کرتا۔
کچھ ہی دیر میں پولیس پارٹی بھی جائے واردات پر پہنچ گئی۔ لاش کو اپنی تحویل میں لیکر باضابطہ کارروائی شروع کی۔ وہ بھی مڑ گیا۔ وہاں سے کھسک جانے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔ اُسے محسوس ہوا کہ سب لوگ دیدۂ تر محوِ حیرت سرگوشیوں میں محو ہیں۔

''پہچان ہوئی ہے اُس کی؟'' وہ ایک دوسرے سے استفسار کرتے رہے۔

''ابھی تک نہیں۔ نامعلوم آدمی لگتا ہے۔ ہوسکتا ہے وردی پوش یا مخبر ہو۔ کسی جرم کی پاداش میں ہلاک کردیا گیا ہو۔''

''تم نے کیسے اندازہ لگایا۔''

''پتلون خاکی رنگ کی ہے نا۔''

تو کیا ہوا۔ کوئی مجاہد خاکی رنگ کی پتلون پہن نہیں سکتا۔''

''بحث سے کوئی فائدہ نہیں۔ کل تک سب اخباروں میں آجائے گا۔'' بھیڑ میں سے ایک شخص نے اپنا مخلصانہ مشورہ دیا۔ جسے سب سنکر خاموش ہوگئے۔

پولیس نے ایف، آئی، آر درج کیا۔ لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے روانہ کردیا گیا۔ بالواسطہ یا بلاواسطہ پوچھ تاچھ شروع ہوئی۔ کوئی چشم دید گواہ نہیں ملا اور نہ ہی کوئی شہادت دینے کے لئے سامنے آیا۔ بالآخر پوری بستی کا محاصرہ کرلینے کا اعلان ہوا۔

وہ خاموش سب باتیں سنتا رہا۔ اُس کے سینے میں نفرت کا لاوہ پھوٹ پڑا۔ غصہ میں وہ ان تمام لوگوں کا خون چوس لینا چاہتا تھا یا بالوں سے گھسیٹ کر ادھ موا کرنا چاہتا۔ لیکن وہ بے بس اور مجبور تھا۔ وہ پہلے ہی سے قلب کے عارضہ میں مبتلا تھا۔ نیا نیا اسی بستی میں قیام پذیر ہوا تھا۔ کسی سے کوئی جان پہچان نہ تھی۔ کسی کو دوست بھی نہ بنا سکا۔ اُس کے دل کو ایک ٹھیس سی لگی شدید درد محسوس کرتے ہوئے وہ بوجھل قدموں سے گھر لوٹ آیا تھا۔

دوسرے دن علی الصبح بازار سے لوکل ڈیلی اخبار خرید کر لایا اور اپنے کمرے میں آکر اخبار کی سرخیوں سے اُلجھتا رہا۔ کل ہوئی اس واردات کے متعلق خبر چھپی تھی۔ کل صبح نئی سڑک پر ایک مسخ شدہ خون میں لت پت سرکٹی لاش پائی گئی۔ قریب ہی اُس کا سر دھڑ سے بالکل کٹا ہوا پایا گیا۔ سرورق پر لاش کی ایسی تصویر تھی جسے دیکھ کر وہ لرز اُٹھا۔ جذبات سے مغلوب ہوکر اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا کہ شہر کے مشہور و معروف گنجان

علاقے کی نئی سڑک پر ایک نجی گودام کے عقب میں کسی نامعلوم شخص کی لاش پائی گئی۔ ابھی تک اس کی شناخت نہ ہوسکی۔ بستی میں چند مشکوک افراد کی گرفتاری بھی عمل میں لائی گئی۔

ایک دوسری خبر یہ تھی کہ کل لال چوک میں بی ایس ایف کے ایک آدمی کو اغوا کرلیا گیا۔ تاہم اُس کا سراغ پانے میں انٹلیجنس ناکام رہی۔ دونوں وارداتوں کے پیچھے عسکریت پسندوں کا ہاتھ سمجھا جاتا ہے۔ البتہ ابھی تک کسی دہشت گرد تنظیم نے اس کی ذمہ داری قبول نہیں کی۔ خبر پڑھکر اسکے دل میں ایک ہوک سی اُٹھی۔ ذہن میں طرح طرح کے خیالات اور آنکھوں میں وہی منظر گھوم گیا۔

''کل کی واردات سے متعلق کچھ چھپا ہے۔'' ریحانہ کے استفسار نے اُسے چونکا دیا۔ جیسے ننگے پیروں تلے کوئی بچھو آ گیا ہو۔ اُس نے چائے کی پیالی رکھدی اور اُسکی نظریں اخبار پر جم گئیں۔

''تصویر آئی ہے۔ کوئی نامعلوم آدمی لگ رہا ہے۔''

''خدا رحم کرے روز روز کتنی ہلاکتیں ہورہی ہیں۔ کسی کو کوئی فکر نہیں۔ کون مرا؟ کیسے مرا؟ کس نے مارا کیوں مارا؟ یہ کوئی نہیں سوچتا۔

انسان مرا۔ انسانیت مری۔ انسانیت کے علمبردار مرے۔ انسانیت کے دشمن مرے۔

سوالات آبلوں کی طرح اُٹھتے رہے جوابات بھی پہاڑ کی طرح ساکت ملے۔

''ہمارا واویلا کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ چار سو سوگ ہی سوگ ہے۔ کوئی غم گسار نہ کوئی مرثیہ خوان۔ موت کے فرشتے نے اب یہاں اپنا ڈھیرا جمالیا ہے۔''

وہ دونوں جذبات کی رو میں کافی دور تک بہتے رہے۔

اخبار کی سرخیوں میں شہر اور دیہات کے اتھل پتھل ماحول، شور شرابا، آبرو ریزی اور چوری ڈکیتی کے واقعات۔ وہ اخبار نہیں بلکہ خون آلود چھیتڑے کو چاٹ رہا ہے۔ غصے میں آکر اخبار کو مروڑنا چاہا تو نیچے ایک اور افسردہ کرنے والی سرخی نے اُس کے سر پر بھاری ہتھوڑے کی

ضرب لگائی۔ وہ سناٹے میں آ گیا۔ اُسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا قریبی گاؤں میں نامعلوم دوشیزہ کا جسم ویران کھیت میں ایک پیڑ سے لٹکتا ہوا پایا گیا۔

وہ پھر سے انگشت بدنداں ہوا۔ اب اُس کا سارا جسم بالکل نڈھال ہو گیا۔

اُسے ایسے تلخ تجربہ کا سامنا اُس وقت کرنا پڑا تھا۔ جب اُسے اپنی بہن شازیہ کے المناک حادثہ کی خبر ملی تھی۔ ایک ایسا ہی غم کا پہاڑ اُس پر ٹوٹ پڑا تھا کہ ابھی تک اُس دہشت کے مہیب سائے اُس کے تعاقب میں لگے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ کہیں بھی کوئی بھی ایسا واقعہ پیش آتا تو اُس کے مندمل زخم پھر سے ہرے ہو جاتے۔ اُس کی آنکھوں میں اس واقعہ کی تصویر گھومتی رہتی۔

اُسے یاد آیا۔

جب وہ بات آناً فاناً ساری بستی میں پھیلی تو لوگوں کا ایک ریلا اُمڈ پڑا تھا۔ جسے دیکھ کر وہ حیران ہو گیا تھا۔ سہم گیا تھا۔ پیروں تلے کی زمین کھسک گئی تھی۔ چہرے کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ جیسے بدن لقوہ زدہ ہو گیا ہو۔ اُس وقت آفندی کی حالت کا اندازہ کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ سارا منظر ہلا دینے والا تھا۔

وہ سب پھٹی پھٹی نظروں سے ویران کھیت کے ایک گوشے میں پیڑ سے ایک نوخیز دوشیزہ کی لاش لٹکی ہوئی دیکھ رہے تھے۔ جس کے دونوں ہاتھ کمر سے باندھے ہوئے تھے۔ ٹانگیں دراز اور ننگے پیر ہوا میں جھول رہے تھے۔ کپڑے جگہ جگہ پھٹے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ سرخ تانبے جیسا جسم صاف دکھائی دے رہا تھا۔ چہرے کا نصف حصہ بالوں میں چھپا بائیں طرف جھکا ہوا تھا۔ عجیب بے بسی اُس کی آنکھوں سے ٹپک رہی تھی۔ کوئی بھی آنسوؤں کو روک نہ سکا۔

وہ ایسی نیم عریاں حالت میں تھی۔ کہ ایک شریف آدمی کو وہ ایک برہنہ گالی لگ رہی تھی۔

لاش اُتاری گئی اور سیاہ کارناموں پر ایک سفید لمبی چادر ڈالی گئی۔

جنازہ اُٹھا۔ جبر ظلم اور ہوس کی داستان دفنادی گئی۔ اس طرح قصہ پارینہ کے صفحہ کے حاشیے میں گمنامی کا کتبہ چڑھ گیا۔

چند دِنوں تک بستی میں چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔ شک وشائبہ کی نئی نئی کہانیاں جنم لیتی رہیں اور کچھ عرصہ بعد بے عنوان کہانی کی طرح پھیکی ہوکر ہر فرد کے ذہن سے یوں اُتر گئی جیسے کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہ ہوا ہو۔

آئے دن بستی کے گردونواح میں نامعلوم افراد کے ہاتھوں سے اس قسم کی وارداتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ تب جاکے لوگوں نے ان واقعات کے پیچھے عسکری تنظیموں یا سرکاری فورسز کی کارستانی کو سمجھ لیا۔

وہ ہمت ہارے جارہا تھا۔ اندر ہی اندر ریزہ ریزہ بکھر چکا تھا۔ بستی میں آفندی کا خاندان شرافت کا مسکن سمجھا جاتا تھا۔ اُن کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ پلک جھپکتے ہی حالات پلٹا کھا گئے کہ سارا گلستان خزاں کے ایک جھونکے سے تاراج ہوگیا۔ بدنامی اور رسوائی کا دھبہ ایسا لگ گیا۔ اب اُسے ہر سو ویرانی ہی ویرانی نظر آنے لگی۔

وہ گھبرا اُٹھا۔ ایک مہینہ کس طرح گذرا اُسے پتہ نہ چلا۔ اب بھی خوف کے سائے سر پر منڈلاتے نظر آتے۔ ذہنی خلفشار سے اُس کی صحت کافی متاثر ہوئی تھی۔

کئی ڈاکٹروں سے مشورہ کیا گیا۔ ای، سی، جی، ایکسرے اور باقی ٹیسٹ ہوتے رہے اور سب نے بتایا کہ اُسے عارضۂ قلب ہو چکا ہے۔ دوائیں تجویز ہوئیں لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ اس کی تیمارداری میں ریحانہ نے کوئی کسر نہ چھوڑی۔

اُس کا دل بستی سے اُچاٹ ہوا۔ اب وہ بستی سے دور کسی اور جگہ جانے کی ضد کرنے لگا تاکہ ذہنی سکون مل سکے۔ وہ کہتا کہ اس لاقانونیت میں زندہ رہنا بہرحال ضروری ہے۔ اپنے لئے نہ سہی بیوی بچوں کے لئے ہی سہی۔ اُسے بے حد افسوس تھا کہ بستی میں اُسکی بہن شازیہ کو

کوئی بچا نہ سکا۔ نہ اب تک کوئی موردِ الزام ٹھہرا۔ نہ وہ اب تک یہ جان سکا کہ آخر یہ کس کی سازش تھی۔

پھر اُس نے بستی سے چلے جانے کی ٹھان لی۔ دوست احباب کے اصرار کے باوجود بستی میں زیادہ دیر تک ٹک نہ سکا۔ متبادل جگہ کی تلاش میں شہر کا رخ کیا۔

ریحانہ نے بھی چپ سادھ لی۔ اس کے فیصلے کے خلاف کوئی مزاحمت نہ کی۔ چپکے سے سارا مال و متاع سمیٹ لیا۔ اور نکل پڑی۔

جاتے ہوئے اُس نے ٹیکسی کے عقب کے آئینے میں دیکھا کہ کئی عورتیں آنسوں بہا رہی ہیں۔ چھوٹے بچوں کی ٹولی دور تک پیچھے دوڑی چلی آئی۔ شاید ان سب کو اپنے چھوٹے ساتھیوں کی جدائی کا غم تھا۔

شہر میں آتے ہی آفندی نے کرائے پر مکان لے لیا۔ دونوں بچوں کو نزدیکی اسکول میں داخل کروادیا۔ وہ سوچنے لگا کہ شاید شہر گونا گوں مصروفیات اور گہما گہمی کا نام ہے۔ لوگ آزاد گھوم پھر رہے ہیں۔ نہ کوئی پابندی ہے۔ نہ کوئی ڈر و خوف، سب اپنے اپنے کاموں میں جٹے ہوئے ہیں۔ سب کو اپنی ہی فکر لگی ہوئی ہے۔ اسی طرح مزے میں اُن کی کٹتی رہی اور کیلنڈر کے صفحات بدلتے رہے۔ شہر میں نہ کوئی گولی چلی۔ نہ کوئی دھماکہ ہوا۔ نہ گھر گھر کی تلاشی ہوئی۔ نہ کریک ڈاون ہوا۔ بچوں کی پڑھائی میں بھی کوئی دقت پیش نہ آئی۔ جیسے سارا شہر سنبھل گیا ہو۔

شہر کے اس ماحول میں اُس نے اپنا سب کچھ بھلا دیا۔

دیکھتے دیکھتے ایک دن اچانک دکانوں کے شٹر گرے۔ بھرے بازار میں سنسنی پھیل گئی۔ لوگ دوڑنے لگے۔ جیسے کوئی آسمانی آفت ان کا پیچھا کر رہی ہو۔ گاڑیوں کی آمد رفت معطل ہوگئی۔ لوگوں نے مکانوں کی کھڑکیاں دروازے بند کر لئے۔ ایک مکمل خاموشی چھا گئی۔

دور کہیں سے رک رک کر گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی پڑ رہی تھیں جس سے سارا

ماحول سنسناہٹ کا شکار ہوا۔ ہر طرف موت کا منظر دکھائی دینے لگا۔ کہاں فائرنگ ہوئی؟ کہاں بم پھٹا، کون مرا۔ کتنے مرے؟ ان گنت سوالوں کی بوچھاڑ چھوٹے بڑے مرد وزن کے ذہنوں میں اُمڈ پڑے۔ سب حیران بجھی بجھی نگاہوں سے ایک دوسرے کا منہ تکتے رہے۔ بچے گلی کوچوں میں کھیلنا چھوڑ کر کمرے میں دبک گئے۔

ایک دن کی بات ہوتی تو کچھ نہ بگڑتا۔ روز روز کسی بھی لمحہ اس غیر متوقع حالت کا وہی اندازہ لگا سکتا ہے۔ جسے کسی سڑک کے دوراہے پر یا کسی گلی کے نکڑ پر ایسی درگت کا سامنا کرنا پڑے۔

ریحانہ خاموش طبیعت ہونے کے باوجود سوجھ بوجھ میں ذہین ثابت ہوئی۔ وہ جانتی تھی کہ اُس کی گری ہوئی صحت کے ساتھ ساتھ گھر کا اُجالا بھی مدھم پڑنے لگا ہے۔
وہ یہ سب کچھ کیسے برداشت کرتی کہ آفندی کے ذہن پر جو غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ وہ ایک معمولی واقعہ سے پھر تازہ ہونے لگتا ہے۔ وہ سوچ میں پڑ گئی کہ اُسے کیسے اس بھنور سے کھینچ نکالے۔

"کسی سوچ میں پڑے ہیں جی"۔

"آں"۔ وہ چونک پڑا۔ اپنے اندر چھپی پریشانی کو چھپا کر بولا" کچھ بھی نہیں۔

"لیکن اس طرح سوچنے سے صحت پر اثر تو پڑے گا ہی۔

بھول جاؤ ان باتوں کو۔ میرا مشورہ ہے کل سے اخبار خریدنا اور پڑھنا چھوڑ دو۔"

"بے شک تم تو شہر میں آکر کافی سمجھدار ہوگئی ہو۔"

تمہیں مذاق سوجھتا ہے۔ میں تمہاری فکر میں گھل رہی ہوں۔

"اُس بات کا شکریہ"۔

چند لمحوں تک بے جان قہقہے کمرے کی چار دیواری میں گونجے پھر اخبار چھوڑ کر اُس نے اپنا دھیان چائے کی پیالی کی طرف کیا۔

اچانک ایک دن ایسا ہوا۔ سورج غروب ہوتے ہی دور سے گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ رات کی سیاہی نے ہر چیز کو اپنے دامن میں چھپالیا۔ کھڑکیوں پر پڑے پردے دراز ہوگئے۔ دیر تک دونوں کمرے میں مبہوت سی صورت بنائے ایک دوسرے کا منہ تکتے رہے۔ بچے سہم کر سرشام ہی لحاف کے اندر جا گھسے۔ اس طرح رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی۔

کئی دنوں تک شہر میں فائرنگ کا سلسلہ چلتا رہا۔ ظاہر سی بات ہے۔ بے چینی اور مایوسی بھی گہری ہوتی گئی۔ ہر طرف ویرانی برسنے لگی۔ اسکول بند ہوگئے۔ کاروباری حالت بدتر ہوگئی۔ ٹرانسپورٹ نظام معطل ہوگیا۔ وہ طرح طرح کی افواہوں کے جال میں اس قدر پھنس گیا کہ اب اس نے اپنی صحت کے بارے میں بھی سوچنا چھوڑ دیا۔

آبائی بستی میں پوچھنے والا کوئی نہ کوئی تو ہے۔ لیکن اس اجنبی شہر میں اپنا کون ہوسکتا ہے۔ ہر ایک کو اپنی فکر لگی رہتی ہے۔ وہ اپنی سوچ میں موم کی طرح پگھلتا رہا پھر اُس نے ریحانہ کو اپنا فیصلہ سنادیا۔

وہ خاموش رہی اور سعادت مند بیوی ہونے کا دوسرا ثبوت دیا۔

واپس اپنی آبائی بستی جانے پر بچوں نے خوشی منائی۔

اُس نے دوبارہ اپنا سارا مال واسباب سمیٹ لیا۔

باہر ٹیکسی والا واپس لوٹ جانے کے انتظار میں ہارن پر ہارن بجاتا رہا۔

دور سے کہیں دھماکے ہوئے۔ فائرنگ کی آواز سے سارا ماحول دہل اُٹھا۔

زینوں سے اُترتی ہوئی ریحانہ سوچتی رہی۔

آفندی اور اُس لاش میں کتنی مماثلت ہے۔ آبائی بستی میں وہ اکیلی نہیں آئی گویا شہر کی سرکٹی لاشوں کے مہیب سائے اور گولا بارود کے پھٹنے کی بدبو بھی ساتھ لائی تھی۔

............☆☆☆............

میلانوٹ

جنوری کے تیسویں دن سورج غروب ہونے کے قریب تھا۔ اُجالا ہلکی ہلکی تاریکی میں تحلیل ہورہا تھا۔

اچانک موسم نے تیور بدلا۔ گذرے ہوئے موسموں سے سارا دن خشم ناک اور جان لیوا ثابت ہوا۔ سورج بُری طرح سیاہ اور گھنیرے بادلوں کی لپیٹ میں آیا تھا۔ پچھلے پہر سے اب آسمان پر کئی بار بادل زور سے گرجتے رہے۔ سن کر ایک اچھے بھلے آدمی کی روح کانپ اٹھتی۔ اس بات کا احتمال رہتا کہ کہیں پرانے وقتوں کی طرح شدید برفباری سے مالی و جانی نقصان کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

خوف کی ایک سرد لہر ریڑھ کی ہڈی میں اترتی چلی گئی اب برف مسلسل ایک گھنٹہ سے گر رہی تھی۔ ٹھہر جانے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ سفید باریک چادر میں ہر شے چھپتی جا رہی تھی۔ سردی بڑھ رہی تھی۔ ساری سڑک اور بازار کی رونق خاموش پڑی اب کسی مرگھٹ کی طرح سونی اور ویران تھی۔ ہر چند اکا دکا ادھ پٹ کھلے دکان کے اندر سے ٹمٹماتے مدھم روشن بتیاں چھن کر گھاس میں جیسے چھپے جگنوؤں کی طرح لگ رہے تھے۔ کئی ان میں شٹر پڑے بھاری آہنی تالے لگے اونگھتے ہوئے سے نظر آرہے تھے دُور دُور تک کوئی راہ گیر کہیں سے دکھائی نہیں دیتا تھا۔ زندگی کی کوئی رمق محسوس نہ ہوتی تھی۔ البتہ جب کوئی رکشا، آٹو، اسکوٹر۔ بس یا ٹیکسی گزر جاتی تو زندگی اپنی موجودگی کا احساس دلاتی۔ سارا ماحول بڑا پراسرار سا تھا۔ زینہ زینہ شام اتر رہی تھی......رفتہ رفتہ سیاہی پھیلتی جارہی تھی۔ جیسے مغرب رات کو جنم

دیتی ہوئی اپنی جانشین ہونے کی علامت کو ظاہر کر رہی تھی۔ ایسا لگتا کہ دوڑتی بھاگتی زندگی اچانک رک سی گئی ہے۔ سامنے کنٹین میں روز کی طرح اسوقت افسردگی اور پژمردگی سی چھائی ہوئی خالی خالی کرسیاں وحشت زدہ اور گھما گھمی معدوم پڑتی ہوئی اب وہاں نام کے صرف چند بلب روشن تھے اوران کی روشنی بھی اتنی مدھم تھی کہ درودیوار پر چڑھے رنگ کا امتیاز کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

یہ بات تشویش ناک ہے۔ لوگوں کو کتنی کوفت اٹھانی پڑتی ہے۔ سال کے بارہ مہینوں میں یہاں وولٹیج کی کمی رہتی ہے۔ سارا کاروبار چوپٹ ہو جاتا ہے اس کا خمیازہ خصوصاً کار خانہ دار کو برداشت کرنا پڑتا ہے یہی وجہ ہے۔ آج تک ہر کوئی سرمایہ دار اِدھر سرمایہ لگانے سے ہاتھ کھینچ رہا ہے۔ بے صبری سے چھٹی ہونے کا انتظار تھا۔

سارے ورکر اپنے سروں پر چھاتا لہراتے ہوئے گھر کی جانب لمبے لمبے ڈگ بھرتے چل پڑے۔ کئی رین کوٹ کے اندر اپنے کو سر سے گھٹنوں تک چھپائے سیاہ ہیولے کی طرح سڑک کے آخری موڑ پر اوجھل ہوتے چلے گئے۔ باقی جو بچے وہ سٹاف بس کے آجانے تک ایک ایک دو دو کر کے کنٹین میں آتے رہے۔ استغراق کے عالم میں اپنے کپڑوں کو چمٹاتے ہوئے ٹھنڈ سے بچنے کی سعی کرتے خالی خالی کرسیوں میں دبکتے رہے۔

دیکھتے دیکھتے سارا کنٹین کھچا کھچ بھر گیا۔ کہ تل دھرنے کو بھی جگہ نہیں رہی۔ صرف دروازہ کے متصل ایک دو پرانی بوسیدہ کرسیاں خالی رہ گئیں تھیں۔ وہاں بیٹھنا کوئی گوارہ نہیں کر رہا تھا۔ بے احتیاطی میں گر جانے کا جو خدشہ لگا رہتا تھا۔

ہال میں داخل ہوتے ہوئے انکے تن میں نئی جان سی آجاتی۔ آتش دان میں تھوڑی سی چھوٹی چھوٹی لکڑیاں سلگ رہی تھیں۔ گرمی میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا۔ اس طرح انہیں راحت کا سانس لیتے ہوئے دو گھڑی کا چین میسر ہوا۔ تب یکے بعد دیگرے میزوں کے تھپتھپانے کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک یا دو کپ چائے کی فرمائش پر ہر کوئی ویٹر کو اپنی طرف متوجہ کرنے لگا۔

کنٹین فیکٹری سے منسلک ایک بڑے ہال کو بنایا گیا تھا۔کام سے فراغت پاتے ہی ورکروں کا وہاں آنا جانا رہتا تھا۔سٹاف بس آجانے تک یہ وقفہ چائے سگریٹ و بیڑی پھونکنے اور گپشپ میں گذر جاتا تھا۔یہ توان کا روز کا معمول تھا۔البتہ چھٹی کے دن بند پڑا رہتا تھا۔

ابھی ابھی برف باہر روئی کے بڑے بڑے گالوں کی مانند گرتی ہوئی پرانے وقتوں کی طرح ریت دہرا رہی تھی۔آج سے پہلے گویا کل ہی کی بات تھی کہ چارسو پیڑ و درختوں کی بے تحاشہ کٹائی کے سبب گھنے جنگلوں کی چھاتیاں خالی ہوئیں اور اونچے اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں کے گنجے پن سے موسموں میں اس قدر اتار و چڑھاؤ آگیا۔اس طرح اجلی اجلی چاندی کی سفیدی پر تانبے کا ملمع چڑھ گیا۔

ہال میں گہما گہمی بدستور عروج پر تھی۔ہر میز پر محفل جمی ہوئی کہیں پر جان لیوا ٹھنڈ کا تذکرہ ہوتا، کہیں آج کی گندی سیاست پر تبصرہ اور کوئی موجودہ کمر توڑ مہنگائی کو رو رہا تھا۔کوئی چور بازاری اور کرپشن کے خلاف بحث میں الجھا راشوں کو گالیاں دیتا رہا۔غرض کسی نہ کسی موضوع پر خوب تبادلہ کیا جارہا تھا۔

ایک گوشے میں میز کے گرد چند لڑکیاں ایک دوسرے سے چمٹی ہوئی سی خوش گپیوں میں محو تھیں۔انہوں نے بڑی لگن سے خوبصورتی میں اضافہ کیا تھا۔تندرست دلکش اور بڑی بڑی خوبصورت کا جل بھری آنکھیں کشمیری آرٹ کا زندہ نمونہ تھیں۔ہونٹ سیب کی قاشوں کی طرح جاذب نظر گلابی لپ اسٹک سے سجا رکھا تھا۔کبھی کبھی قہقہہ مار دیتیں۔دیر تک ہنستی رہتیں تو انکے بھرے ہوئے چہرے آتش دان میں جلتے انگاروں کی مانند دمک جاتے جو اچھے بھلے آدمی کو دیوانہ بنا دے۔کئی منچلے نوجوان بے باک حسینوں کی اداؤں پر مر مٹتے۔کئی معمر ور کر بھی ان میں شامل تھے۔جو کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے لمبی لمبی سانسیں بھرتے سگریٹ کے لمبے لمبے مرغولے فضا میں اڑا دیتے تھے۔

وقفہ کیسے گزرا۔اس بات کا اندازہ کوئی بھی نہ کر سکا۔

اچانک ہال کا دروازہ کھل گیا۔ برف کا بت بنا ایک آدمی ہانپتا گھبراتا ہوا داخل ہو گیا۔ آتے آتے سردی کا ایک جھونکا ساتھ لئے آیا جسے محسوس کرکے سامنے بیٹھے لوگوں نے جھرجھری سی لی۔ جیسے انکے دانتوں تلے کوئی کنکری آ گئی تھی۔ اس کا آنا انہیں گراں گزرا تھا۔

یہ دیکھتے ہوئے وہ نہ سٹپٹایا نہ ٹس سے مس ہوا۔ دروازہ پر کھڑے ہو کر اپنی جھکی گردن کو ذرا اوپر تان لیا پھر دبی آواز میں گالیاں دینا شروع کیں نہ جانے کس سے مخاطب تھا کہ ایسا کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اس کا پورا چہرہ برف سے گیلا ہو چکا تھا۔ سارا جسم ٹھنڈ سے کپکپا رہا تھا۔ میلے کچیلے پرانے کپڑوں پر پرانا اور کوٹ پہنا ہوا غریبی کے چھوٹے چھوٹے ٹاٹ کے پیوند لگے شگاف غربت کا مذاق اڑا رہے تھے۔ آدھے حصے سر کے بال پھٹے اور پرانے مفلر سے ڈھکے ہوئے باقی حصے پر برف کی ایک موٹی سی تہہ جمی تھی۔ اور پاؤں میں ربڑ کا جوتا جوجگہ جگہ ٹانکا گیا تھا۔ اسکے چہرے پر جھریوں نے جال سا بُن رکھا تھا۔ ساٹھ ستر برس کا رہا ہوگا۔ داڑھی میں برف کے پگھلتے قطرے موتیوں کی صورت میں چمک رہے تھے۔

اُس نے آتے ہی فوراً آدھ ڈھکے بالوں سے برف ہٹانا شروع کی۔ بے ترتیب الجھے بال ماتھے پر بکھیرتے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے اور کوٹ کو جھٹک کر ادھر ادھر اپنی نظریں دوڑائیں۔ آگے کہیں خالی جگہ نہ تھی۔ مایوس ہو کر دروازہ کے قریب خالی کرسی میں دراز ہو کر چند لمحوں تک آنکھیں بند کرلیں۔ اسکے بناء کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

تھوڑی سی راحت ملی۔ لیکن سردی بدستور ستاتی رہی۔ کچھ دیر تک وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو آپس میں رگڑتا رہا تو تھوڑی سی حرارت محسوس کی۔ اب جیب سے سگریٹ نکال کر ماچس سے سلگانے کی کوشش کرنے لگا۔ ماچس گیلی تھی۔ نا اُمید ہو کر قریبی آدمی کو مایوسانہ انداز میں دیکھنے لگا جو بیڑی کے کش آرام سے لے رہا تھا۔ وہ اس کا مدعا سمجھ گیا۔

"ماچس گیلی ہو گئی ہے۔" ہونٹ سکوڑ کر ماچس دیکھتے ہی وہ بڑ بڑایا۔

"کوئی بات نہیں"...... کہتے ہوئے نوجوان نے اپنی ادھ جلی بیڑی آگے کردی۔

''شکریہ!''

اتنی دیر کیوں لگا دی عبداللہ!'' عقب کے کونے سے ایک اپ ٹو ڈیٹ نوجوان نے اُسے آواز لگائی۔

''صاحب۔ ہم چوکیداروں کا کام ہی ایسا ہے۔ چھوٹے بڑے بابو کے جانے تک رکنا پڑتا ہے''......اس نے بغیر مڑے جواب دے کر سگریٹ کا لمبا سا کش لیا لیکن اب جو آواز پہچانی تو اپنے دفتر کے کیشر کی سی محسوس ہوئی۔

سامنے ویٹر کو گذرتے دیکھ کر صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔

''بھئی! ایک کپ سموسہ کے بغیر۔ ایک چمچ چینی ڈالنا صرف۔''

ویٹر نے اسکی بات ان سنی کر دی۔ اسکی شکستہ حالی پر بالکل ترس نہ کھایا۔ پاس پڑے میزوں سے پیالے اور رکابیاں سمیٹنے میں مشغول ہوگیا۔

''سنا نہیں۔ میری جان پر بنی ہے۔ کافی ٹھنڈ لگی ہے۔'' وہ احمقوں کی طرح اُسے دیکھنے لگا۔ تو ویٹر فوراً بولا۔

''یوں گیا یوں آیا'' یہ کہکر ویٹر وہاں سے نو دو گیارہ ہوگیا پھر دیر تک کہیں بھی اس کا سایہ نظر نہ آیا۔

اس دوران وہ اپنے ساتھی چپڑاسی کریم کو یاد کرنے لگا۔ جو پچھلے دو دنوں سے فیکٹری سے غائب تھا۔ اُسے ڈیوٹی کے علاوہ اسکی ذمہ داری بھی نبھانی پڑ رہی تھی۔ پہلے ہی بڑے بابو سے کسی بات پر ٹھن گئی تھی۔ اندر ہی اندر وہ انکے برتاؤ پر جل رہا تھا اور شرارت میں آکر نجانے کیا اوٹ پٹانگ بک رہا تھا۔

ہال میں گہما گہمی بدستور اپنے عروج پر تھی۔ جیسے سب لوگ کسی طلسمی باغ میں بزم رقص و سرور میں بدمست ہو گئے تھے اتنے میں ایک اور جھٹکے کیساتھ دروازہ کھل گیا۔ ٹھنڈ کی ایک شدید لہر داخل ہوگئی۔ جس نے خوشگوار ماحول میں بدمزگی پیدا کر دی۔ پاس بیٹھے لوگوں کو

اسکی آمد نا گوار گزری۔

سامنے سردی سے ٹھٹھرتی ہوئی ایک نخیف عورت گود میں کچھ چھپاتی ہوئی اندر داخل ہوگئی۔ سر سے پاؤں تک برف میں نہائی ہوئی.

عبداللہ اُسے دیر تک دیکھتا رہا۔ اُسے اس بات کا احساس تھا کہ غربت کتنی سخت جان ہے کہ ایک غریب کی قدر و قیمت گھٹتی جا رہی ہے۔ ایک فضول اور بے جان شے کی طرح......
پاس بیٹھے نوجوان ایک دوسرے کو پوچھتے ہوئے ہنسی مذاق کا لطف اٹھا رہے تھے۔

''بھئی! اس برفباری میں اس شیطان کی خالہ کا نزول کیسے ہوا؟'' آتش دان کے قریب بیٹھے نوجوان نے ساتھی ورکر سے پوچھا۔

''لگتا ہے آسمان سے جیسے اتری کوئی طوفانی پری ہے'' ساتھی ورکر نے ایک اچھے ہونہار بچے کی طرح جواب دیا۔

''کوئی نیا عجوبہ دیکھنے کو ملا ہے''...... بات آگے بڑھی۔ بڑھتی رہی۔

کتنی دیر تک بے پر کی باتیں اڑتی رہیں۔ وہ انکے سامنے غربت کے نام پر ایک گالی بنی سراپا التجا کھڑی تھی۔ اس نے اپنے سر سے موٹی چادر ہٹا دی۔ تصویر بتاں کا حال کچھ ایسا اچھا نہ تھا۔ اس کا نیم برہنہ جسم آدھا سینہ بالکل ننگا اور چہرے پر وقت کی جھریاں اپنی نا آسودگی بیان کر رہی تھیں۔ ان میں قہقہے مسکراٹیں اور شوخیاں مقید ہو کر رہ گئیں تھیں آنکھوں میں جیسے آنسو چھلک پڑنے کو بے قرار تھے۔ ان آنسوؤں میں لاتعداد مجبوریاں اور حسرتیں ایک ساتھ اُمڈ آئی تھیں۔

گود میں پرانی پھٹی چادر سے لپٹا ہوا ایک لاغر اور ضعیف بچہ تھا جسے سہلانے کی انتھک کوشش کر رہی تھی اسکے وجود پر اتنا بھاری تھا کہ بھوک اور سردی سے رو رو کے بے حال ہو گیا تھا۔ وہ آگے بڑھی

ایک ہاتھ سے بچے کو سینے سے لگائے رکھا۔ دوسرا ہاتھ دراز کئے خیرات کے لئے بڑھا

دیا۔

"بابو جی۔ایک روپیہ کا سوال ہے۔دے دیجئے بابو" اسکی درد بھری آواز میں جانے کتنی مجبوریاں پنہاں تھیں۔ایک ایک کر کے وہ تمام میزوں کے گرد چکر لگاتی بس یہی ایک فقرہ دھراتی ہوئی آگے بڑھتی رہی.

کسی نے اُسے منھ نہیں لگایا۔دوسری طرف اپنا مونہہ پھیر لیا یا احسان کی چوٹی پر اٹھنی یا روپیہ ناک سکوڑ کر دے دیا۔کسی نے دھتکارتے ہوئے پہلے اسکے سراپا کا جائزہ لیا پھر اندر کے چھپے کمینہ آدمی کو دبوچ کر "معاف کرو" کہتے ہوئے انسانیت کا بھرم قائم رکھا۔

لڑکیاں بھی کہاں کچی گولیاں کھیلی تھیں۔نسوانیت کے نام پر اشارے سے ہی اُسے دور رہنے کی تلقین کی۔صرف ایک لڑکی نے پرس سے ایک روپیہ کا سکہ گویا حاتم طائی کی قبر پر لات مار کر اسکی ہتھیلی پر رکھ دیا۔جبکہ دوسروں نے بے احتیاطی سے ہاتھ چھتہ پر رکھنے سے گریز کیا......

"خدا کے نام پر دے دے وہ تیرا بھلا کرے گا"

اس بار اس نے پہلے کی طرح سوال کو بے اثر سمجھ کر خدا کو بیچ میں لا کھڑا کر دیا۔لیکن اکا دکا آدمیوں کے سوا کسی نے دھیان نہ دیا اُسے اس پر کوئی افسوس بھی نہیں ہوا۔لیکن اب ان کی بھوکی نظریں اسکے نیم برہنہ بدن کے نازک حساس کے انگ انگ کو جیسے چاٹنے لگیں۔نیم برہنہ عورت مرد کے سامنے گویا شراب کی بوتل کی طرح ہوتی ہے۔نشہ چڑھے تو چند لمحوں کی خاطر اُسے درندہ بنا دیتا ہے۔

تھک کر جب وہ اس غول سے باہر نکل آئی۔ہاتھ پھیلا کر عبداللہ چوکیدار کے سامنے پہنچی تو چھیتڑوں کی شہزادی اُسے چند ثانیے تک سوچتی دیکھتی رہی۔اس بات کا اندازہ لگا رہی تھی کہ اپنے خدوخال جیسا آدمی ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھا کسی سوچ میں غرق تھا۔

"خدا کے نام پر کچھ دے دے وہ تیرے بال بچوں کو خوش رکھے۔صبح سے بھوکی

ہوں۔ بچے کے واسطے ہی دے دے..........رو ہانسی صورت میں اس نے اپنی بے بسی اس طرح ظاہر کی۔ گویا کوئی خشک ٹہنی پیڑ سے الگ ہو کر زمین پر گرنے والی ہو۔

اس کی آواز پر وہ چونک پڑا۔ نیند میں جیسے کسی نے اسکے سر پر برف کا جما ٹکڑا مار دیا ہو۔ وہ متحیر ہو کر اُسے دیکھتے ہوئے اپنی بیمار بیٹی کو یاد کرنے لگا۔ جو کئی دنوں سے بستر پر پڑی بے تحاشہ کھانسی میں مبتلا ہو چکی تھی۔ معاً اسکی نظریں چہرے سے پھسل کر اسکے ہاتھ پر مرکوز ہو گئیں لوگوں کے اس سنگدل رویئے کو دیکھ کر اُسے گہرا دھچکا لگا کہ انسانیت کے نام پر ھمدردی جتانے والوں کے بس پانچ چھ روپے سے ہتھیلی پر کسی گالی سے کم نہیں تھے۔

''اتنی رقم ایک وقت کی بھوک مٹانے کے لئے ناکافی ہے''......وہ بڑبڑاتا رہا۔ ایک تناؤ اسکے اندر جاگ اٹھا۔

ماں کی چھاتی بچے کے منہ سے چھوٹ گئی۔ تو اس نے دوبارہ بلکنا شروع کر دیا کہ سننے والے کا دل خود بخود پسیج گیا۔ اسکی سوچ پر ایک زوردار طمانچہ پڑتے ہی بلا تامل اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ وہاں اُسے صرف پرانا میلا دس کا نوٹ ہاتھ لگا۔ اس پر مہاتما جی کی تصویر گویا غریبی ہٹاؤ کی مہر ثبت تھی۔

اتنے میں ویٹر چائے لے کر آ گیا۔ اتفاق سے باہر گاڑی نے کئی بار ہارن بجائے۔

''اب اسکی ضرورت نہیں۔'' یہ کہہ کر وہ یک لخت کھڑا ہو گیا اور ویٹر کو حیرت میں مبتلا کر دیا۔

ویٹر مبہوت بنا اُسے دیکھتا رہا۔ اس کا منہ حیرت کے مارے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ کبھی اسکی پھٹی پھٹی نظریں بھکارن کو اور کبھی ادھ مرے نوٹ دیکھے جا رہی تھیں۔

چند لمحوں کے لئے تو وہ جیسے ٹھٹک گئی۔ حیرت بھری نظروں سے اُسے گھور گھور کر دیکھنے لگی۔ دور کسی مسجد شریف سے موذن کی آواز آ رہی تھی۔

''خدا تیرا بھلا کرے۔ تیرے بال بچوں پر رحم کرے''......دیر تک اسکی درد بھری دعا

ہال میں گونجتی رہی۔

سارے ورکروں میں ایک کھلبلی سی مچی ۔ سارا خوشگوار ماحول تتر بتر ہو گیا۔ وہ اُسے وداعی نظروں سے اور معنی خیز مسکراہٹ چھوڑتے ہوئے اس معاملے میں گویا گونگی کا گڑ کھائے ایک ایک کر کے نکل گئے۔

باہر بس کا ہارن بجتا رہا۔

دیکھتے دیکھتے سارا کنٹین خالی ہو گیا۔ اب بھکارن کے سوا کوئی اور دوسرا وہاں کھڑا نہ تھا......وہ نم ناک آنکھوں سے اپنے ہاتھ کو دیکھنے لگی جو بالکل خالی تھا۔

وہ کسی ٹوٹی ٹہنی جیسی نیچے جھکی اور برف کی پھیلی پرت میں کچھ ٹٹولنے لگی۔ اسکے چہرے پر عجیب سا دکھ عجب سی اداسی پھیل گئی۔ جسم سے قوت پہلے ہی جیسے پنکھ لگا کر اڑ گئی تھی۔

بچہ بدستور چیختا ہوا ماں کی چھاتی سے بار بار منہ لگا رہا تھا۔ اسکی دردناک آوازیں خلاء میں ساکت ہو گئی تھیں۔

ویٹر کچن میں خالی خالی پیالے اور رکابیاں لے کر لوٹ گیا تھا۔

بس فیکٹری کے گیٹ سے باہر نکلنے لگی۔

بسیار تلاش کے بعد بس کی ہیڈ لائٹنگ میں اسکے ہاتھ میں میلے پرانے نوٹ کا آدھا حصہ آ گیا تھا......!!!

............☆☆☆............

گمشدہ اشتہار

پگلی! پگلی!

کوئی اُسے دیکھ لیتا تو دبے دبے اس کے ہونٹوں پر یہ نام آتا۔ بڑ بڑاتا رہتا اور مسکرا کر رہ جاتا۔ بستی کے چند لوگوں نے اسے ایک نام دے رکھا تھا۔

سنتے سنتے وہ دل برداشتہ ہوتی نہ خائف ہو جاتی۔ کئی مہینوں سے یہاں اس بستی میں آ کر نجانے اُسے کن کن ہزیمتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

بسا اوقات کئی آوارہ گرد اور شرارتی بچوں کے نرغہ میں آ کر ممیاتی بکری کی طرح پھنس کر رہ جاتی تب وہ کسی تنہا گوشہ میں بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتی ہوئی بالکل نڈھال اور بے بس ہو جاتی۔

اب وہ بڑوں کی بے تکی اور غیر مبہم باتیں سننے کی عادی ہو چکی تھی۔ ان کی نیت میں کھوٹ تھی۔ وہ اتنا جان چکی تھی کہ چور چوری سے جائے پر ہیرا پھیری سے نہ جائے۔ جس مقصد کو لے کر یہاں آئی تھی اُسے پورا کرنا تھا۔ ابھی تک وہ سینکڑوں جو کھم اٹھا کے اپنے ارادوں پر مضبوطی سے قائم تھی۔ باوجود اس کے دل میں خوف بھرا ہوا تھا۔

بستی میں اس کا کوئی پیچھا کرتا، خباثت بھرا چہرہ سراپا مجسم حیرت میں اسے تکتا ہوا پا کر پہلے اس سے خوابوں کا محل ٹوٹتا اور بکھرتا نظر آتا۔ شک کا سایہ دماغ کے کسی گوشے میں سرسراتے ہی اسے خوفزدہ کر کے بے وجہ اسکی زندگی اور روح کے رشتہ میں زہر گھولتا رہتا۔

انگلیوں کی پوروں پر حساب جوڑتے ہوئے اتنا اندازہ ہو جاتا کہ اس وقت اس کی عمر لگ بھگ پچاس کے اوپر تھی۔ پھر بھی اس کا تنومند اور پھرتیلا جسم ہمیشہ کام میں لگا رہتا۔ ابھی سر کے سیاہ بالوں میں سفیدی کا کوئی نام ونشان بھی نہیں تھا۔ چہرے پر معمولی سی جھریاں بھی نمودار نہ ہوئی تھیں۔ ایک سدا بہار......شاداب چنار کا درخت جیسا کھڑا کہ دیکھنے والا متحیر ہو کر رہ جاتا۔ جس نے ایک بار دیکھا تو بڑی آسانی کے ساتھ اسے بھول نہیں پاتا۔

زندگی کی کئی بہاریں دیکھنے کے بعد اب اُسے بڑھاپے کی خزاں رسیدہ موسموں کا سامنا ہوا لیکن ابھی تک وہ ان بیتے دنوں کو بھلا نہیں سکا۔ کسی نہ کسی موڑ پر کوئی نہ کوئی شرارت کرتا ہی رہتا۔ جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے۔ وہ ضدی طبیعت قسم کا آدمی تھا۔

اتنا وہ جانتا تھا۔

ہمیشہ ہر بدھ کے روز علی الصبح ایک سیاہ نقاب پوش سفید چادر اوڑھے اس کی دکان کے سامنے گذرتا ہے۔ اسے کنکھیوں سے دور تک جاتے ہوئے دیکھتا رہتا ہے اور وہ اس وقت اپنی دکان کھولنے میں مصروف ہوتا جب بہت سے لوگ اپنے اپنے بستروں میں لیٹے ہوئے کروٹیں بدل رہے ہوتے۔

نان بائی کی دکان سے دہکتے تندور کی گرم گرم روٹیاں بید کی ٹوکری میں لے کر آتا تو ابھی تک کچھ لوگ مسجد شریف میں ذکر واذکار میں ہی محو ہوتے اور وہ اپنی راہ لیتا ہوا دکان کی صفائی کی فکر میں لگا رہتا۔ یہ تو اس کا روز کا معمول تھا۔ اُجالا ہوتے ہی دکان کے سامنے ہمیشہ ایک چھوٹی سی بھیڑ لگی رہتی۔

عام لوگوں کا خیال ہے کہ دکان کی کچی اینٹوں والی دیواروں میں وافر مقدار میں مال ہے جو چھوٹی چھوٹی پوٹلیوں اور بوسیدہ زنگ آلودہ بند کنستروں میں بے ترتیب پڑا برسوں سے میلے اور گرد آلودہ ہو رہا ہے۔ اپنے آبائی مکان کے ایک کمرے کو کریانہ کی دکان کی شکل دے کر پچھلے تیس برسوں سے حاجی علی جو بنا مول بھاؤ بنا، مول بھاؤ محلے میں اپنی سلطنت قائم

کئے بیٹھا تھا۔ بیٹھے بیٹھے وہ ہر کسی پر کڑی نگاہ رکھ سکتا تھا اور اِدھر سے گذرنے والا بھی اسے بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ علیک سلیک ورسمی بات کئے بغیر نہیں رہتا۔

شام کو جب سورج غروب ہوجاتا۔ لوگ اپنے دھندوں سے فراغت پاتے۔ اکادکا اس کی دکان پر آتے دیر تک تازہ ترین سیاسی خبروں پر خوب بحث ہوا کرتی۔ کبھی کبھی محلّہ کی کسی انہونی کو موضوع بنا کر بے لاگ تذکرے ہوتے۔ نیکی اور کارِثواب سمجھتے ہوئے اچھے شہری ہونے کا پورا پورا ثبوت دیتے۔

اس بیٹھک میں زیادہ تر بوڑھے بیکار اور اوباش قسم کے نوجوان حصہ لیتے۔ ایک عجیب ساسماں بندھا رہتا۔ پھر بیڑی، سگریٹ اور چلم سے اٹھتی چنگاریاں خلاء میں اڑی اڑی رہتیں۔

آج سے پہلے گویا کل ہی کی بات تھی...... وہ کئی مہینوں سے پناہ گزین کی حالت میں اس کے ہمسائیگی میں رہ رہی تھی۔ دور کے رشتہ میں وہ اس کا کچھ تھا جسے وہ کب کا فراموش کر چکا تھا۔

دن بھر رحمدل لوگوں کے برتن صاف کر کے بڑی مشکل سے اس کا گذارہ ہوتا تھا۔ باہر سے دیر رات تک چرخہ چلانے کی گڑگڑاہٹ کی آواز بھی سنائی پڑتی اور وہ ہمیشہ کسی فکر میں غلطاں رہتی۔

ایک عرصہ ہوا۔

وہ ان کے زیر بحث موضوعات میں سرفہرست بنی رہی۔ اس پر الزام تھا۔ جب سے لوگوں نے اسے بس اڈوں اور پولیس تھانوں میں جاتے دیکھا تھا۔ تب سے وہ ایک سر پھری عورت سمجھی جانے لگی تھی۔ اس کی سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ وہ ہمیشہ ہر ایک کو تکتی رہتی۔ یہ بات ان کے دماغوں میں بری طرح کھٹکتی رہتی۔ اس بناء پر سارے محلے میں وہ مشکوک نظروں سے دیکھی جاتی۔

اس کی نگاہوں میں ایک مسلسل تلاش تھی۔ نجانے کس کو ڈھونڈا کرتی۔ گھنٹوں کھوئی

کھوئی رہتی، کسی کا انتظار ہو رہا ہے؟ رشتے میں وہ اس کا کیا ہو سکتا ہے؟ یہ بات اب تک بستی میں کوئی نہیں جان پایا تھا۔ یہی بدگمانی کی وجہ تھی۔ ہر بدھ کو علی الصبح آنکھیں میچتے ہوئے بستر سے اٹھا کرتی، ہاتھ منہ دھو کر بنا ناشتہ کئے حضرت مخدوم صاحبؒ آستانے پر زیارت کے لئے چلی جاتی۔

تھوڑی دیر تک دعائیں مانگتے مانگتے ڈھیروں آنسو بہا دیتی۔ سسکیاں لیتے لیتے دوپٹہ بھی تر ہو جاتا۔ ایک آدھ مٹھی بھر دانہ جنگلی کبوتروں کے حصہ میں آتا۔ باقی بچا کچھ فقیروں اور مساکین کے خیرات میں چلا جاتا، چاول سے بھرا تھیلا وہ اپنے نفس کو کاٹ کاٹ کر ساتھ لے جانا کبھی نہ بھولتی۔

اس نے کسی مولوی صاحب سے سنا تھا کہ زیارت قبور سے دل کی مراد پوری ہوتی ہے اور خیرات سے دعا قبول ہو جاتی ہے۔ برسوں سے بدھ کو وہاں ایک روحانی مجلس ہوا کرتی۔ درود اور منقبت پڑھی جاتی، ہر ایک اپنا اپنا مدعا بیان کرتا۔ پھر بھی اس کی بات جہاں تھی وہی رُکی رہی۔ دُعاؤں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس کا من پراگندہ ہوتا رہتا۔

عجیب عجیب بے پر کی باتیں لوگوں نے اُڑا دیں۔ جتنے منہ اتنی پھلجھڑیاں فضاء میں چھوٹتیں۔ کوئی اس کا اندازہ نہ کر سکا۔ اس کی حالت سے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کوئی پگلا اس کی زندگی میں دن کا چین اور راتوں کی نیند اُڑا چکا ہو یا لپا چھپی کھیل کر آنکھ بچا کر کسی بھیڑ میں کھو گیا ہو یا کسی تنہا گوشے میں چھپ گیا ہو۔ ایک موہوم سی اُمید لئے وہ آستانے پہ حاضری دینے چلی آتی۔ آنکھوں میں غیر معمولی چمک لئے حسین مستقبل کے خواب دیکھتی رہتی۔

وہ اُس دن کو بھولی نہیں تھی جس دن اس کے ہرے بھرے چمن میں آگ لگا دی گئی۔ دیکھتے دیکھتے اس کی دنیا لٹ گئی تھی یک خوشحال زندگی بھنور کی نذر ہو گئی۔ وہ سہمی سہمی آہ زاری کرتی رہی لیکن ٹھکرانے والا بڑا سنگدل اور سفاک نکلا۔ جس نے اسے دیوانی بنا کر چھوڑا۔ اس کی جدائی میں اس نے اپنی صورت دیوانوں جیسی بنا دی۔ اس کے لوٹ آنے کی فکر کرتے

کرتے وہ اکثر بس اڈوں میں دیوانہ وار ڈھنڈنڈ کر مایوس لوٹ آیا کرتی تھی۔

وہ مشکوک بنی، کسی کے بہلاوے کی شکار ہوئی، وہ اکثر سوچتی رہتی۔ رہ رہ کے اس کے ذہن میں وسوسے سر اُبھارتے، سانپ بنے کنڈلی مارتے، کوئی لمحہ ایسا نہ گزرا جب شدت غم سے کوئی بُرا خیال نہ آتا...... سوچتی کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی کی محبت کے دام میں پھنس کر گمشدگی کے عالم میں چلا گیا ہو جہاں سے لوٹ کر واپس آجانا اُس کے بس میں نہ رہا ہو۔

یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ اچانک اس کی زندگی سے وہ اس طرح فرار ہو گیا ہو، پیچھے مڑ کر دیکھنا گوارہ نہ کیا، اسے بے مروّت دنیا میں اکیلا چھوڑ دیا لیکن وہ کہاں ہمت ہارتی اور چپ چاپ بیٹھی رہتی۔ تھانوں میں جا کر وہ رپوٹ کی یاددہانی یا گمشدگی کی معلومات حاصل کرتی رہتی۔ اتنی بے قرار ہوتی بنا آب مچھلی جیسی تڑپتی۔

اسے اس بات کا پورا گمان تھا کہ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی دن اس سے سامنا ہوگا۔ اس جذبہ انتظار میں وہ دیوانہ وار عجیب عجیب حرکتیں کرتی رہتی تھی۔

ایک دن وہ معجزاتی طور پر بچ نکلی، بس اڈہ کے عقب میں داخل ہوئی تھی کہ دو بدمست شرابیوں کے جال میں بری طرح پھنس گئی۔ شور غل نہ مچاتی، آسمان سر پر نہ اٹھاتی تو ان کی ہوس کی شکار بن جاتی۔ کرنا خدا کا ایسا ہوا عین موقع پر کہیں سے دو سپاہی نمودار ہوئے۔ ڈنڈے ابھی اٹھائے نہیں کہ دونوں بدمعاش رفو چکر ہوئے۔ یہ تو اس کی قسمت تھی کہ دونوں سپاہی اس کے گاؤں کے جانے پہچانے نکلے۔

گاؤں میں سارا مال متاع چھوڑ کر وہ شہر بھاگ آئی تھی۔ صرف اتنا ہی جان پائی تھی کہ چند شرارتی لوگ اس کی جان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے من میں کھوٹ تھا۔ اب وہاں اس کا بچنا محال تھا اور مزید جینا حرام تھا، ہر چند وہ اب اتنی جوان اور خوبصورت نہیں تھی کہ ایک ٹک دیکھنے والے کو مقناطیسی کشش سے اپنی طرف کھینچ لیتی۔ البتہ سڈول جسم ان کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ اس کی چھاتیاں جنگلی کبوتروں کی طرح پھڑ پھڑاتی رہتیں،

جس سے بدگمان لوگ رال ٹپکانے لگتے۔ ڈھلتی عمر کے ساتھ ساتھ بالوں میں چمکتی سفیدی کسی مصور کی کھینچی لکیریں جیسی دکھائی دیتی تھیں۔

گاؤں میں اکثر لوگ کہا کرتے۔ کسی بھرم سے چپکے رہنا سراسر بے وقوفی ہے۔ حالات سے سمجھوتہ کر لینا عقلمندی کی نشانی ہے۔ ان کی باتیں تیزاب کی طرح اس کے وجود کو جیسے جلا دیتی تھیں لیکن وہ اپنے آپ کو کم ہمت بنائے ہاتھ پر ہاتھ دھری نہ بیٹھی، گاؤں گاؤں شہر شہر اس کی تلاش جاری رکھی۔ اس نے ذرہ ذرہ چھان مارا کونہ کونہ ڈھونڈا......لیکن اس کی یہ حرکت نازیبا سمجھ کر بہت سے اعتراض اٹھائے گئے۔ بہت سے الزامات لگائے گئے۔ ڈر تو اس بات کا تھا کہ طعنوں کی بوچھاڑ میں کہیں وہ اپنا دماغی توازن نہ کھو بیٹھے۔

بہت سے لوگوں نے یہ شوشہ چھوڑا کہ وہ بدلے کی آگ میں پاگل ہوگئی ہے ورنہ کیونکر ایسا سب کچھ کر رہی ہے۔ ہو نہ ہو کوئی شاطر ڈرامہ رچا رہی ہو، جوگن سی بنی، در در ٹھوکریں کھا رہی ہے۔

اس بات کا اندیشہ لگ رہا تھا کسی تیز دماغ نے موقع کا فائدہ اٹھا کر پہلے اسے ڈرایا دھمکایا اور اب اس کی ساری جائیداد ہڑپ کرنے کے لئے اپنا راستہ ہموار کیا ہو۔ ایسا نہ ہوا تو ممکن ہے ہتھیانے کے لئے ایک دوہری چال چل رہا ہو کہ وہ اس کے فراق میں اپنا دماغی توازن کھودے پھر خود بخود کامیابی اس کے قدم چومے۔ اس کی بات سننے والا گاؤں میں بستا جیسے کوئی نہیں تھا۔

جب سے مشتبہ حالات میں گاؤں والوں نے اسے گاؤں کے باہر دھکیل دیا تھا۔ تب سے وہ حاجی علی جو کے محلّہ میں پناہ گزین ہو کر بسنے لگی تھی۔

حاجی علی جو کریانہ فروش ہشاش بشاش عمر سے دس سال کم نظر آ رہے تھے۔ عاشقانہ فطرت رکھتے تھے۔ ابھی بیوی کو مرے ہوئے چھ ماہ بھی نہ گزرے۔ اوروں کو پھنسانے کے چکر میں لگے رہتے۔

وہ اُسے ہر روز آتے جاتے تیکھی نظروں سے دیکھتے دم بھر سرد سرد آہیں بھرتے ابھی تک اس کے اندر ہوس کا درندہ مرا نہیں تھا۔ وہ اکثر اپنے خوابوں میں اسے دیکھا کرتے۔

یہاں آکر بھی راحت نصیب نہیں ہوئی۔ اُمید کی موہوم جھلک لئے بے عنوان کہانی بنی رہی۔ انتظار کرتی رہی، تھکی تھکی نڈھال چپہ چپہ چھان مارتی رہی۔ نجانے جدائی کے غم میں کتنی راتیں جاگ کر گزار دیں، بے قرار نگاہوں کو دور خلاؤں میں بھٹکاتی جانے کب سے تلاش میں غلطاں رہی۔

معمولی سی بات کو رائی کا پہاڑ بنا دیا گیا۔ گاؤں والوں نے اسے پگلی پگلی کے نام سے پکارنے کے علاوہ اتنا احسان کر دیا کہ بے ننگ و نام نکال دیا، سانس لینے کے لئے بس خالی خالی جسم چھوڑا...... شہر والوں نے مزید اس کے سر پر کانٹوں کا تاج رکھ دیا۔ دبے دبے لفظوں میں مخبری کا الزام لگا دیا۔ یہ بے تکی بات سن کر اسے دل میں ایک پھانس سی چبھتی ہوئی محسوس ہوئی پھر بھی اس نے اپنی زبان پر راز نہیں لایا۔

علی جو کو جو بھنک لگی۔ اسے گرم گرم لوہے پر ہتھوڑا مارنا آسان دکھائی دیا۔ دیکھتے دیکھتے بارود کا ایک ڈھیر کھڑا کیا۔ اب صرف ایک تیلی لگا دیتا، سارا خاکستر کر دینے میں ذرا دیر نہ لگتی۔

اچانک بستی میں بات چھپ چھپا کے اتنی آگے بڑھی جیسے تیل نے آگ پکڑ لی ہو، لوگوں کی دریافت میں ایک چھوٹی سی بات سے ایسا کہرام مچا کہ ہر ایک نے اپنی انگلی دانتوں تلے دبالی۔

مسجد شریف کے ممبران نے فوراً ایک ہنگامی اجلاس بلایا۔ اس کے صحن میں ہی مجلس عاملہ کے سامنے اس عورت کو روبرو کھڑا کیا گیا تو مولوی صاحب کی قیادت میں علی جو کے پہلے سوال نے اُسے چونکا دیا۔

"یہ شریفوں کی بستی ہے، تمہاری حرکتیں شک و شبہ سے خالی نہیں۔ تمہارا یہاں رہنا

ہم بستی کے لوگوں کو گوارہ نہیں ہے۔

مولوی صاحب نے اپنی دراز داڑھی پر بار بار ہاتھ پھیرا۔ وہ بت بنی اُسے دیکھتی رہی کہ مولوی صاب بولے۔

''بہتر ہے تم کسی دوسری جگہ اپنا بوریہ بستر اسنبھالو اور دوبارہ اپنی منحوس شکل نہ دکھاؤ''

مولوی صاحب بات کی وضاحت کر کے چپ ہو گئے۔

''میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا''۔ اس نے بلا تامل مختصر جواب سے اپنی لاعلمی ظاہر کی۔

یہ سنتے ہی ان کے جسموں پر چونٹیاں رینگنے لگیں ایک دوسرے سے کھسر پھسر ہوئے۔ علی جو کی بات گونجی۔

''سنا ہے تم پولیس تھانوں اور بس اڈوں میں جایا کرتی ہو۔ یہ بات شریف بہو، بیٹیوں اور شرم دار عورتوں کے لئے ٹھیک ہے کیا؟''

علی جو آپے میں نہ تھا وہ دو تین قدم آگے بڑھا اور زور سے دہاڑ کر بولا......''تیرے خلاف الزام ہے تو مخبری کرتی ہے''۔

اس الزام نے چند لمحوں تک اُسے حیرت میں مبتلا کر دیا۔ وہ یہ سوچنے لگی کہ گاؤں میں تو اسے صرف پگلی پگلی کہا گیا تھا اور شہر والوں نے اسے مخبری کے جال میں ہی پھانس دیا۔

سانسوں کا زیر و بم منتشر ہوتے ہی اسکے اندر ایک تناؤ جاگ اُٹھا۔ ایک عجیب سی کیفیت سے آنکھوں میں نمی اُتر آئی۔ چہرے پر تجسس کے رنگ مزید گہرے ہو گئے جیسے اس کے اندر سوکھی گھاس نے آگ پکڑ لی ہو۔ پھر وہ ضبط کا دامن صبر سے تھامے نہایت نفاست سے کہنے لگی۔

''افسوس ہو رہا ہے۔ ہمدردی کے دو بول کے لئے ترستی رہی اور اب یہ الزام......''

اس کی آواز اچانک رندھ گئی جیسے کسی نے گلا دبا دیا ہو۔

''جو کچھ اپنی صفائی میں کہو گے مگر مچھ کے آنسو بہائے بغیر سچائی میں کہنا۔ عورت

ذات کالحاظ ہے ورنہ بے موت ماری جاؤ۔ کوئی کندھا دینے والا بھی نہیں ہوگا یہاں"۔

مولوی صاحب نے ایک چھوٹی سی تقریر فرما کر مسجد شریف کے مینار پر اس فاختہ کی طرف دیکھنے لگے جو مینار کے سرے پر اپنی ٹانگ میں پھنسا پتنگ کا دھاگہ چھڑانے کی کوشش کررہی تھی۔ وہ آنکھوں میں ڈھیر سارے آنسوں لئے انکساری سے بولی.

"مولوی صاحب! میرا ایک جوان بیٹا تھا، آج سے دس مہینے قبل ٹھیک بدھ کے دن گاؤں میں کسی نامعلوم جماعت نے اُسے گرفتار کرلیا تھا۔ منت سماجت کی اور پوچھ پچھ کے بعد انہوں نے اسکو دوسرے بدھ کو چھوڑنے کا وعدہ کیا تھا لیکن ابھی تک اسکا کوئی اتہ پتہ نہ چل سکا۔

تب سے مخدوم صاحبؒ کے آستانہ پر منتیں مانگنے، ہر تھانے اور اڈے میں دیکھنے کے لئے جایا کرتی ہوں کہ شاید کسی نہ کسی بدھ کو چھوڑا جائے ۔ میرے پاس اس کی تصویر محفوظ ہے"۔

مسجد شریف کے سارے ارکان شرمندگی سے اپنی نظروں کے ساتھ ساتھ گردن بھی جھکائے بت بنے کھڑے سن رہے تھے۔

لائبریری روم میں شہداء کے البم کی ہر تصویر سے موازنہ ہونے لگا دفعتاً آخری صفحے نے سبھوں کو حیرت زدہ کردیا۔

تب ان کی نظریں باہری مزار کے سنگ مرمر لگے کتبوں میں اس کی گمشدہ قبر کو کھوجنے لگیں......!!!

آدھا سچ

بھیگی شام اپنی سیاہ باہیں پھیلا رہی تھی۔ پلیٹ فارم کے نزدیکی کوئلہ گودام سے مزدور اپنے اپنے گھروں کی طرف نکل پڑے تھے۔

وہ بوڑھے چنار درخت کے قریب کھڑی سراپا انتظار تھی۔ اس کا سایہ دور دُور تک دکھائی نہیں پڑ رہا تھا جبکہ دونوں ایک ہی محلّہ میں رہا کرتی تھیں۔ لمحے سیل رواں کی طرح گذرتے جا رہے تھے۔ ایک عجیب سا دکھ اور بے قراری اسے اپنے نرغے میں لے رہی تھی۔ چند ثانیوں تک وہ اپنی جگہ رکی رہی۔ آگے کی جانب بڑھنے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھی کسی قدر تذبذب کا شکار تھی۔

گھر میں نوری واحد عورت ذات تھی پھر بھی کچن میں کام سے فارغ ہو کر ریشمان کے ساتھ جایا کرتی تھی۔ جبکہ رشیماں کی ماں اپنے گھر میں خود ہر کام خوشی خوشی انجام دیتی تھی۔

نوری جانتی تھی۔ دیر ہو جانے پر سلامہ کی پھٹکار اور گالیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن سلامہ پھٹکار کے باوجود بھی اُسے ہمیشہ اپنی نظروں کے سامنے دیکھنا پسند کرتا تبھی اسکی نظر سایہ کی طرح تعاقب میں لگی رہتی نوری شام ہوتے ہی قلانچیں بھرتی ہوئی دوڑی دوڑی لوٹ آیا کرتی۔

چرخے کی طرح کام کرتے کرتے اسے اس بات کا تو ہوش نہ رہا کہ کب اس دوراں وہ کھلنے لگی اور تیزی سے کلی کی طرح بڑھتی چلی گئی۔ پندرہ سال کی ہوئی۔ بالکل دبلی پتلی سی ہونے کے باوجود اس کا سینہ ابھر آیا تھا جو کھلے ڈھیلے ڈھلے فراق کے اندر چھپا ہمیشہ اس پر پرانے

میلے ڈوپٹہ سے ڈھکا رہتا۔ کوئی اسکے بارے میں کیا اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ ایک دو آتشہ سے کم نہیں۔

بھائی کی خشم ناک نظریں ہمیشہ تاک میں لگی رہتیں۔ بال سنوارنے۔ اچھے ڈھنگ کے کپڑے پہنے یا پاؤں میں پازیب لگانے کی اجازت نہ تھی نہ ہی خود نوری کے دل میں بھی کوئی کسک تھی۔ وہ ان باتوں سے بے پروا تھی اسی وجہ سے وہ مطمئن سی سیدھی سادی ور بھولی بھالی لڑکی دکھائی دیتی تھی۔

نوری سوت کات کات کر گھر کا گذارہ چلانے میں بحیثیت ایک اچھے معاون اور مددگار کے اپنے فرائض کامیابی سے انجام دیتی رہتی۔ ہر صبح وشام کھانا پکانے کی فکر کرتی۔ بجلی کی چوری کرنے میں سرکاری ترسیل سے کنکشن جوڑنے سے ہچکچاتی بستی میں لوگوں کی ترچھی نظریں ہمیشہ تاک میں لگی رہتیں۔ گیس اور تیل جلانے کی سکت نہ تھی۔ ورنہ بیٹھی بیٹھی منٹوں میں گرم گرم پکا کھانا بھی دستیاب ہوتا رہتا۔

جس روز شام کو بجلی کٹوتی ہوا کرتی۔ کوئلہ ڈیپو پر جانے کی لت جاگ اُٹھتی۔ شیڈول کے مطابق دو دن ہفتہ میں بجلی کا ہر بار ناغہ ہوتا رہتا۔ ایک اچھا سا موقعہ ہاتھ لگا تو اُسے کیسے جانے دیتی۔ ایسا نہ کرتی تو کئی کئی دنوں تک فاقے میں رات گذارنے کا دھڑکا رہتا۔ چھوٹی عمر ہونے کے باوجود اُسے لاکھ سمجھایا لیکن وہ نہ سنبھلی. حالانکہ سلامہ پورے پورا ایک ہفتہ کی کمائی نوری کے ہاتھ میں تھما دینے سے نہ چوکتا۔ دن بھر آوارہ گردی کر کے رات گئے گھر آتا۔ تھکا تھکا نڈھال بستر پر ڈھیر ہو جاتا۔

کبھی کبھی نوری کی کمائی پر گانجا چرس پیتا تھا ساتھ ہی اسے جوا کھیلنے کی عادت بھی پڑ چکی تھی۔ شرم کی بات تھی خود کنوارا رہا۔ چھوٹی کے ہاتھ پیلے کرنے کا کوئی احساس نہ تھا، ایسے آوارہ گرد نوجوانوں کی بستی میں کوئی کمی نہ تھی۔

''اتنی دیر لگا دی۔ بستی کی لڑکیوں نے کب کے اپنے تھیلے بھر دیئے ہونگے'' اُسکو

دیکھتے ہی اسکی تنہائی کا پھنکارتا ہوا ناگ بے موت مر گیا۔ بھوکی شیرنی کی طرح اس پر جھپٹ پڑیں۔ ریشمان نے ناراض ہو کر نوری پر اپنی خفگی ظاہر کی۔ جو ایک مدت سے اسکی راہ تک رہی تھی۔ معمول کے مطابق وہ وقت مقرر پر ملا کرتی اور اپنے کام پر نکل جاتی۔

نوری زیر لب مسکرائی اور اسکی ناراضگی نظر انداز کرتے ہوئے اسکی ہتھیلی پکڑی۔ پھر وہ دونوں لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی سنسان گھنے درختوں کی اوٹ میں چھپ گئیں۔

آس پاس کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ آسمان کی وسعتوں میں چیل کوؤں اور آبی پرندوں کے کئی غول اڑتے اڑتے پیڑوں کی ٹہنیوں پر اپنا تسلط جمائے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی شرارتی منچلے کوے پر پھڑ پھڑاتے ایک درخت سے دوسرے درخت پر بیٹھ جاتے۔ رنگ کے کالے ضرور تھے لیکن بڑے متوالے۔ بھید و بھاؤ اور اونچ و نیچ کا ذرہ بھی خیال نہیں۔ جیسے ڈیڑھ ماشہ دماغ کے سامنے منوں بھر مٹی لوندے ہیچ ہوں۔

قطار در قطار درختوں میں دونوں بھاگی جا رہی تھیں۔ روز کی طرح اِدھر اُدھر نظریں گھما کر دور کھلے کھیت کے گودام کی طرف آ رہی تھیں۔ گھبرائی ہوئیں۔ چہروں پر ہوائیاں اڑی ہوئیں منہ سے بات نہیں نکل رہی۔ اشاروں اور کنایوں سے کام لیتی ہوئی۔

گھنے میوہ دار درختوں سے باہر آتے ہی ریلوے پٹری سانپ کی طرح بل کھاتی دکھائی پڑتی۔ وہ ایک دوسرے کے پیچھے پنڈولم کی طرح کبھی ایک آگے ہو جاتی تو دوسری پیچھے رہ جاتی آگے پیچھے دوڑ کے اس جگہ پر آ گئے۔ یہاں سے دور تک ان کی نظریں جا سکتی۔ بیچ بیچ میں کہیں سیمنٹ سے بنے بڑے بڑے پائپ تین تین چار چار کر کے بکھرے ہوئے تھے۔

"شکر ہے کسی نے دیکھ نہیں لیا ورنہ رنگے ہاتھوں پکڑے جاتے"۔

ریشمان نے ایک دو منٹ سانسوں پر قابو پا لیا اور نوری کا ہاتھ زور سے پکڑا۔ اسی اثناء میں اُس نے ماتھے پر پسینے کی بوندیں دوپٹے کے کونے جذب کر دیں۔

"غضب ہوتا۔ آج تو نے کافی دیر کر دی اب تو اس کا مزا بھی چکھ"۔

اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔!

انہوں نے چاروں اور نظریں گھمائیں۔ ابھی تک کوئی نظر نہ آیا۔ آسمان پر جھلمل ستاروں میں وہ پٹری کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ دور سے شیڈ کا دروازہ کھلا پڑا دکھائی دے رہا تھا۔

"گڑبڑ لگ رہی ہے۔ کوئی وہاں کھڑا ہے"۔

"کوئی نہیں۔ یہ تمہارا وہم ہے۔" ریشمان نے اسکی ڈھارس بندھائی۔ بے کار کی باتوں میں الجھنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ آگے کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اسکی زبان گنگ ہوگئی۔ یہ دیکھ کر ان کی آنکھیں متحیر کہ بستی کی دو نوعمر لڑکیاں بھری تھیلی لے کر باہر آ رہی تھیں برق رفتاری سے وہ پاس ہی پڑے سیمنٹ کے پائپ میں جا گھسیں۔

شیڈ کے اندر کھسر پھسر ہو رہی تھی۔ فاصلہ دور نہ ہوتا۔ ان کی ذات کا پتہ لگ جاتا کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔

"دال میں کچھ کالا ہے"۔ نوری سچائی جاننے کے لئے اتاولی دکھائی دے رہی تھی۔

"آج ناحق تو نے پھنسا دیا ہے"۔ ریشمان کے چہرے پر سوالیہ نظروں سے دروازہ کو تکتی جا رہی اور اسکے جسم میں چونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔

"چپ رہ پگلی۔ بے تکی رٹ لگا رکھی ہے"۔

وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ آج اس نے بھرے بازار میں اپنے آپ کو برہنہ ہوتے ہوئے محسوس کیا۔

"لگتا ہے۔ ابھی کوئی اندر موجود ہے"۔ منع کرنے کے باوجود اسکی زبان قینچی کی طرح خاموشی کو کترتی رہی۔ لیکن نوری کی چھٹی حس اسے پہلے ہی آگاہ کر چکی تھی۔ اپنی نفسیاتی خواہش کو دبا نہ سکی۔ پسینہ سینہ کی نالی سے اترتا سیدھے ناف کے نیچے تک چلا آیا۔ دونوں رانیں بھگو دیں۔ نشانہ پر جا لگا۔ قندیل پیٹرول کنستر زد میں آ گیا۔

''میں چپکے دیکھنے جارہی ہوں۔تم یہیں انتظار کرتے رہنا''۔

''کیا بک رہی ہو۔ پاگل نہ بنو'' ریشمان نے سختی سے روک دیا۔ وہ محسوس کررہی تھی کہ ابھی کتنے، کوؤں اور چیلوں کی بلی چڑھ جانے کا خطرہ ٹل نہ گیا تھا۔

''مجھے نہ روکو۔ ایک بار دیکھنے میں حرج کیا ہے؟''

''شاید تمہاری شامت آرہی ہے۔ خاموش دیکھتی جاؤ منہ کالا کروانے کا ارادہ ہے کیا؟''

نوری نے اپنا منہ دبا کر چپ سادھ لی۔ اسٹیشن بابو پتلون کے بٹن درست کرتا ہوا وہاں سے نو دو گیارہ ہوگیا۔ گارڈ بھی اسکے پیچھے پیچھے بھاگتا رہا۔ یہاں تک کہ پٹری عبور کر کے وہ ریلوے ڈھابہ کے باہر چھوٹی سی بھیڑ میں کھو گئے۔

سب ماجرا دیکھا۔ سب باتیں سمجھ میں آگئیں۔ ان کے چہرے لال پیلے ہو چکے تھے۔ آنکھوں میں خوف کے سائے منڈلانے لگے تھے۔ سارے بدن پر لقوے کا اثر دکھائی دے رہا تھا۔

ابھی ابھی وحشت کی مار ٹانگوں پر پڑی تھی۔ اٹھ نہیں پا رہے تھے۔ پھر بھی ایسا محسوس ہونے لگا کوئی انھیں زبردستی گھسٹتے جارہا ہے۔ تب اچانک ایلورا کی مورتیوں میں جان آگئی۔ ان کی زبان ہلنے لگی۔

''چلو اب بھاگ چلتے ہیں۔''...... سیمنٹ پائپ کی اوٹ سے باہر آئے۔ شکاری کتوں کے ڈر سے جسم تھرتھرا رہے تھے۔

''نہیں! نہیں۔ یہی اچھا موقع ہے۔ پلٹ آنا ان کے بس میں نہیں'' وہ اسے سمجھاتی رہی۔

''انھوں نے دروازہ کو کھلا چھوڑ دیا ہے''۔

''چائے وسکی پینے گئے ہوں۔ حالات معمول پر آنے تک لوٹ آئیں گے''۔

"اچھا ہی ہوا۔ جلدی میں خیال نہ رکھا"۔

"اندھیرا ہو رہا ہے۔ باقی کل پر چھوڑ دو۔ وقت کو بے کار باتوں میں نہ گنوا دو۔"

بیک وقت دو بلیوں کی مانند وہ کوئلے کی گودام پر ٹوٹ پڑیں۔ ایسی چابکدستی سے الگ الگ دونوں نے اپنے گنے تھیلے بھر دیئے کہ نہ ہاتھ کالے ہوئے اور نہ چہرے پر دھول کی پرت چڑھنے دی۔ وقت بھی اتنا زیادہ نہ لگا ورنہ ایک ایک دو دو کر کے ڈھونڈتے ڈھونڈتے جمع کرتے آدھی جان نکل جاتی بچ نہ پاتیں......

تھیلیوں کو شکم سیر پا کر بجلی کی طرح وہاں سے متبادل راستے کاٹتے ہوئے اس بوڑھے چنار درخت کے قریب رک گئیں۔ جو برسوں سے انتظار میں کھڑا ہر آنے جانے والے کا سواگت کرتا رہتا ہے۔ قریب آ کر دونوں ٹھٹھک گئیں ایک دوسرے کا منہ ہونقوں کی طرح دیکھتی رہ گئیں۔

پاس ہی ہموار پتھر کے ٹیلے پر بستی کے دونو جوان خفتہ پڑے تھے اس بات کی گواہی کہ مشتبہ حالت میں سانسیں لے رہے تھے۔ آہٹ پاتے ہی ان میں سے ایک نے بوجھل آنکھوں سے نوری کو دیکھا۔

وہ جاننا چاہتا تھا کہ اندھیرے میں اتنی تک دیر کیوں لگا دی۔ مگر بات ہونٹوں پر پھسلتے ہوئے سنبھل نہیں پا رہی تھی۔ ادھ کھلی نظروں سے خاموش دیکھتا رہ گیا۔ شاید وہ اسوقت اپنے اوسان کھو چکا تھا۔

بسا اوقات کسی کی شامت سے الٹی آفتیں گلے پڑتی ہیں مجبوری کی حالت میں حواس باختہ ہوئے تو سیاہ و سفید کی تمیز نہیں کر پاتے۔ اس دلدل میں گرنے سے وہ اپنے آپ بچاتی رہی۔ ورنہ اسکے عتاب کی شکار ہو کر رہ جاتی۔

چوری کرنا ایک بُرا فعل ہے۔ چھوٹی ہو یا بڑی۔ ہر کوئی اُسے بُری نظروں سے دیکھتا ہے۔ پیشہ ور افراد کا ماہرانہ انداز کسی کو پتہ نہیں لگ پاتا۔ لگے تو اگلے پچھلے کا پول کھل جاتا ہے۔

''سلاما یہاں پڑا ہے۔'' نوری نے آنے والے خطرات کا اندازہ کرلیا۔ لیکن ریشمان نے ٹوکتے ہوئے ندی کے پل کے رستہ کی طرف دھکیل دیا۔ مضبوط دل کی تھی۔ کوئی جھنجٹ مول نہیں لینا چاہتی۔ سلاما کی طرح اپنے اوسان کھونا نہیں چاہتی۔

''دوسرا کون ہو سکتا ہے'' نوری کا دل ڈوبنے لگا۔ ریشمان اُسے تسلی دیتی رہی۔

''جو بھی ہو۔ ہمیں اس سے کیا لینا دینا''۔

پُل کے بیچ پہنچ کر نوری نے دوبارہ پلٹ کر ٹیلے کی طرف دیکھا۔ خوف خونخوار کتے کی طرح پیچھا نہ چھوڑ رہا تھا۔ ایک سے دامن بچا لیتی تو دوسرا دبوچ لیتا۔ اپنے آپ کو کوستی رہتی ۔ صحیح وقت پر جانے کا اندازہ نہ کر سکی۔

''گھبرا رہی ہوں۔ کہیں بستی میں وہ بات نہ پھیلے۔'' نوری کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ وہ بول اٹھی۔

بستی کے بیچوں بیچ ندی گزر رہی ہے۔ نجانے کتنے سالوں سے خشک خستہ حالت میں پڑی ہے، فضا میں کثافت بڑھی۔ کوہساروں پر سالہائے کی برف جمی نہیں۔ پرانے وقتوں کی طرح روانی پانی میں نہ رہی۔ اب بس ایک پتلی سی لکیر دور دُور تک بہتی جا رہی ہے جگہ جگہ ٹوٹا جھکا ہوا اپل اونگھتا ہوا دکھائی پڑ رہا تھا۔ کسی بانجھ عورت کی گود کی طرح کوئی راہ گذر سے خال خال نظر آتا تھا...... لوگوں نے تین چار بڑے پتھر ندی میں ڈالے تھے۔ اُن کا زینہ بنا کر اس پار آتے جاتے تھے۔

ندی کے اس پار تھوڑے سے فاصلے پر ایک چھوٹی سی بستی آباد تھی۔ لوگ غریب تھے مگر محنت کش تھے۔ دن بھر گاؤں کے بہت سے مرد ریلوے اسٹیشن پر محنت و مزدوری اور چائے و بیڑی بیچ کر گذارہ کرتے تھے۔ شام کو چولہے دہکتے ہوئے نظر آتے۔ چرایا ہوا کوئلہ جلایا جاتا تھا۔

کئی سال قبل ریل کی پٹری پر کام ہو رہا تھا۔ گاؤں کے باہر ایک سب اسٹیشن قائم ہوا۔

ویران کھیت میں الگ تھلگ ایک کوئلہ گودام شیڈ کی صورت میں بنا۔

بستی کی غریب گھرانوں کی کئی عورتیں اور لڑکیاں شام ہوتے ہی زیرِ تعمیر شیڈ پر گدھ کی طرح ٹوٹ پڑتی تھیں۔ ادھر ادھر پڑے کوئلے ڈھونڈتے ڈھونڈتے اپنے تھیلے بھر کر پھر سے پھدک اڑتیں کہ عملہ کو کانوں کان خبر نہیں رہتی۔ تب کہیں ہانڈی چولھے پر اُبلتی رہتی۔

سامنے دوراہے پر پہنچ کر وہ دونوں دو حصوں میں بٹ گئیں ایک حصہ میں نوری کا مکان پڑتا تھا۔ تین کمرہ والا۔ ایک گاؤ خانہ سے کم دکھائی نہ دیتا تھا۔

اس کی سوچ میں بھنور پڑے۔ وہ سلاما کے متعلق سوچنے لگی۔

سلاما پہلے ایسا نہ تھا۔ کشمیری شالوں پر سوزنی کڑھائی پیشہ پر گذارہ ہو رہا تھا۔ مہنگائی کے ہاتھ دراز ہوئے اُجرت میں گھاٹے نے دانت دکھائے۔ پھر بھی بمشکل سانسیں چلتی رہیں۔ بیرونی ریاست کی مشینی اور سستے داموں پر سیاحوں نے مال خریدا۔ کشمیری کاریگر کے نمونوں سے ہاتھ کھینچ لیا۔

فاقہ کشی کی نوبت آگئی۔ اذیت ناک احساس نے سوچ کو مفلوج بنا دیا۔ سلاما کی بستی پر قہر جو ٹوٹا۔ اسکی دنیا تاریک ہوئی آوارہ گردی نے زور پکڑا۔ ذہنی تناؤ میں الجھتا رہا۔ گانجا چرس جوا کھیلنے کی فکر کرتا رہا۔ راتوں امیروں جیسے خواب دیکھتا رہتا۔ کارخانہ سے نکل کر سڑکوں پر کسب معاش کی فکر میں کام ڈھونڈتا ڈھونڈتا پھرتا رہا۔ موقعہ ملتے ہی نوری کی جمع کردہ پونجی پر ہاتھ مارتا تھا۔ بُرے کاموں پر داؤ لگاتا رہتا۔

صحن کے ایک کونے میں لمبی لمبی سانس کھینچ کر اس نے تھیلا گھاس پھوس کے نیچے چھپا دیا۔ پرانی چند بوریاں اوپر ڈالنے کا ارادہ کیا۔ شیڈ میں مہیب سائے کا خیال آیا۔ یہ اس کے لئے پہلی بار غیر متوقع تھا۔ ایسے حالات کا سامنا کرتے ہی فطرت کی آنکھوں میں چمک آجاتی ہے۔ دل دھک دھک کرنے لگتا۔ اس نے آج تک مزا چکھا نہیں۔ بار بار من میں ہوک اٹھتی رہی۔ شرم سے پانی پانی ہو رہی جھٹک کر ذہن سے خیال نکال دیا۔

کمرے کے اندر چلی گئی۔ جلدی میں مرغیوں کو ڈربے میں بند کرنا بھول گئی۔

موم بتی اٹھائی ۔ کمرہ روشن ہوا ۔ پھر بھی کئی بہت سی چیزیں اسکی نظروں سے چھپی رہیں۔

ہاتھ منہ دھوتے دھوتے اس کا من پھر کالا ہوا۔ رہ رہ کے خونخوار گدھ پیچھا کرتا رہا۔ بھاگ کر کہاں تک جاسکتی تھی۔ ایک پیاسی مچھلی کی طرح تڑپ اٹھی۔ تھکی ماندی خوف سے لرزاں اپنے بستر پر ڈھیر ہوئی۔ سلاما کے آنے تک انتظار نہ کرسکی۔

صبح ہوئی۔ سورج کی کرنیں کھڑکی کے پٹ سے دخل اندازی کرنے میں مصروف تھیں۔ ابھی تک نوری گہری نیند سوئی ہوئی تھی خلاف توقع فجر کی اذان کانوں میں نہیں گونجی ۔پچھلی یادوں کے ملبہ میں دبی پڑی تھی۔

سلاما دروازے کے پٹ کھٹکھٹاتا رہا۔ فحش گالیاں بھی بک رہا تھا۔

اس وقت آنکھ کھلی جب بستر کے قریب کھڑا وہ خونخوار نظروں سے گھورتا رہا۔ تھوڑا نشہ ابھی طاری تھا۔ اناپ شناپ بک کر تھک گیا تھا۔ آنکھوں سے دو نیزے دوڑنے کو آتے تو نوری کا چہرہ سرخ سرخ ہو جاتا تھا۔

"حرام زادی! آفتاب سر پر آیا اور تو خراٹے لینے میں مست ہے ۔تھوڑی سی شرم کیا کر۔"

وہ جھینپ سی گئی۔ سہم کر کانپتی ہوئی ادھورے وجود کے کپڑے درست کرتے ہوئے دوپٹہ سر پر ڈال لیتی ۔ مارے شرمندگی سے نظریں نیچی کیئے بستر سے آرہی کہ دوبارہ اسکی آواز نے چونکا دیا۔

"کل رات کتوں نے دو مرغیاں اڑائی ہیں اور تم دیکھتی جارہی تھی۔"

نوری کی زمین ہل گئی۔ چھت کی دیواروں میں دراڑیں پڑ کر پاش پاش ہورہی ہوں اور وہ اسکے نیچے آرہی کہیں اُسے اس بات کا پتہ نہ لگ گیا ہو۔ بات گھما گھما کر بار بار پوچھتا

رہا۔

""مگر......" وہ اتنا کہہ سکی۔اس سے زیادہ خوف سے زبان نہ ہل سکی۔

""دروازہ کھلا چھوڑا کسی کا بھی ہاتھ پہنچ سکتا تھا۔"

کہہ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ ہاتھ منہ دھونے کے واسطے ندی کی طرف تیز تیز قدموں سے چل پڑا۔ جہاں اس میں ایک پتلی سی پانی کی لکیر بہتی اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی۔

طلوع آفتاب ہونے سے قبل روز ایک گھنٹہ تک ندی کے کنارے پر اکثر نوجوان کسرت کرتے تھے۔آج وقت پر نہ پہنچا۔ پارہ چڑھ گیا۔نوری بے خبر سوئی تھی۔

اس اثناء میں نوری کوئلہ انگھیٹی پر گرم گرم ہاتھ سے بنی چپاتیاں بناتی رہی اور چار پانچ کپ کشمیری چائے اس کے آنے تک سموار میں ابل رہی ہوتی۔

""کل رات تم کو کسی نے دیکھا تو نہیں؟" واپسی پر سلاما تشویش بھری نظروں سے غور سے دیکھتا رہا۔

""نہیں تو......اسکے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ مختصر سا جواب دے دیا۔

""شیڈ کے آس پاس۔" دوبارہ چونکا دینے والے سوال نے پھر اسے خوف کی گہرائی میں دھکیل دیا۔

وہ سچائی اور جھوٹ کے درمیان اٹکتی رہی۔ وہ جانتی تھی۔ سچائی کے اظہار پر وہ بھائی کی نظروں میں مشکوک ہو جاتی کذب بیانی سے کام لینا پڑا۔

""نہیں تو......مگر یہ تم کیوں پوچھتے ہو؟"

وہ انجان بنی رہی۔ معصومیت کے پردہ میں چھپی رہی۔ جبکہ وہ سارے واقعات کی چشم دید گواہ تھی۔

""آج سے تمہاری چوری چکاری بالکل بند۔ مانا کہ چرسی۔ موالی اور ایک نمبر کا جواری

ہوں۔ لیکن ایسا نہیں ہوسکتا اپنی بہن کی عزت کو بھی داؤ پر لگاؤں۔ مالک نے میری سن لی۔ اسٹیشن پر کام مل گیا۔ پورے ایک مہینہ کا ایڈوانس لے رکھا ہے۔

اس نے جھٹ اپنی شرٹ کی جیب سے نوٹوں کی ایک چھوٹی سی گھڑی نکال کر نورآی کے ہاتھوں میں کسی امانت دار کی مانند سپرد کردی۔

نورآی تشکر کی نظروں سے سلاما کو دیکھتی جا رہی تھی۔ اُسے پورا یقین ہوگیا کہ اس واقعہ نے ساری بستی کو ہلا کے رکھدیا ہے لیکن سلآما کو اپنی چھوٹی بہن پر پورا اعتبار تھا۔

نورآی بھی ہر حالت میں اُسے کھونا نہیں چاہتی تھی۔ ورنہ بہت سی لڑکیوں کی طرح وہ بھی ریلوے پلیٹ فارم کے قہوہ خانہ کی انگھیٹی میں سیاہ راکھ میں مبدل ہوکر رہ جاتی۔

..................☆☆☆..................

اماوس

ابھی پورا ایک مہینہ بھی نہ ہوا تھا۔

اتنے مختصر عرصہ میں ڈھابہ سے بس اسٹاپ تک سارا ماحول جانا پہچانا لگا۔ بس اسٹاپ پر بیٹری بیچنے والے سے اُس بنجارن عورت تک جسے پیلی شرٹ پہنے نیلی نیلی آنکھوں والا نوجوان ہمیشہ گھورتا رہتا تھا..... کتنا خوش نصیب تھا وہ...... میں اکثر سوچتا رہتا......!

ایک مدت بعد مفصلاتی گاؤں سے شہر میں تبادلہ ہوا۔ یہ گاؤں بس اڈے سے صرف تین کوس دور تھا..... مجھے آج بھی وہ پہلا دن یاد ہے......

اُس دن کی شروعات بس اسٹاپ پر بس سے اُتر کر سب سے پہلے اُس نیم برہنہ عورت کے جسم کو چھو کر ہوئی تھی۔ میرے سارے جسم میں کرنٹ سی دوڑ گئی تھی۔ میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس اُس کے خدوخال قابل دید تھے۔ قدرت نے اُسکی جوانی مفلسی کی قبا میں چھپائی تو تھی لیکن وہ تب بھی کافی جاذب نظر لگ رہی تھی جیسے کوئی بھولی بھالی فاختہ مٹی میں نہائی ہو۔ اُس نے پہلی بار آواز دیکر مجھے چونکا دیا۔

"صاحب.....ایک روپیہ کا سوال ہے"۔

میں چند لمحوں تک اُس کا سراپا دیکھتا رہا...... سوچتا رہا...... اُسکی ادھ کھلی چھاتی سے لپٹا ہوا شیر خوار بچہ سویا ہوا تھا۔

سامنے ریڑی پر کوئی کبڑا آدمی جیسے اوندھے منہ گرا ہوا تھا۔ میلی قمیض جگہ جگہ پر پھٹی ہوئی جہاں سے اُس کی کمر کی کالی تن صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اُسکے جسم سے عجیب قسم کی بُو کا بھبکا آیا...... میں نے جھٹ سے ایک روپیہ کا سکہ اُسکی ہتھیلی پہ رکھ دیا اور اُسکے رخساروں پر پھیکی سی مسکراہٹ کھل اُٹھی۔

''بھگوان سلامت رکھے'' ...... چلتے چلتے اُسکی آواز دور تک سنائی دی۔

بس اسٹاپ پر کئی اوباش قسم کے نوجوانون نے شاباشی شاباشی کے فقرے کسے۔ پیلی شرٹ پہنے نیلی نیلی آنکھوں والا لڑکا اُنہیں ڈانٹ پلا رہا تھا۔ میں نے کوئی برا نہیں مانا اور آگے چل دیا۔

اگلے دن اُسے پھر اُسی جگہ پایا۔ وہ تیزی سے لپکی پھر اُسی انداز میں ہاتھ بڑھایا۔ وہی سوال...... اُسکی جھولی میں ایک اور سکہ آگرا۔ اُسی طرح دعاؤں سے شروعات اور آمین پہ اختتام۔ لینے دینے کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ دلچسپی بڑھتی رہی۔ وہ اکثر خوابوں میں انگڑائیاں لیتی رہی اور میں اکثر اُن میں ڈوبتا رہا۔ مقناطیسی چیزوں کو چومتا، کھیلتا اور مزہ لیتا رہا۔ اُسکا سراپا...... دراز قد۔ سڈول جسم، گول گول چہرہ، بیضوی آنکھیں، کالے گھنیرے بال۔ لچک دار چال، بس صابن کی ایک ٹکیہ ہمالہ پہ برف جیسی اُجلی رنگت لانے کے لئے کافی تھی۔

ہاں یاد آیا...... میرے سمجھانے پر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی تھی۔ لکیر کی فقیر بنی رہی۔ بے جھجھک صاف صاف دوٹوک لفظوں میں اتنا بولی۔

''صاحب...... ہم جیسے بھک منگے فقیروں کی یہ حالت دیکھ کر لوگ روپیہ دو روپیہ دیتے ہیں۔ نہا دھو کر اُجلے اُجلے کپڑوں میں بھیک کون دے گا''۔

اس کا جواب میرے سوالوں پر بھاری تھا میں نے اس سے آگے سوچنا ترک

کردیا......لیکن ایک دن وہ سہمی سہمی آنکھوں میں تردد لئے میرے قفریب آئی۔ میں چونک کر دوقدم پیچھے ہٹ گیا اور اپنا غصہ چھپا نہ سکا۔

"تم ذرا ہٹ..."

"صاحب......صاحب۔" اتنا کہہ کر اُسنے میری جانب عجیب نظروں سے دیکھا۔ اُسکی آنکھیں پُرنم تھیں......میں نے ہونٹ سکوڑ لئے۔ اُسے خوب ڈانٹنا چاہا لیکن کوشش کے باوجود بھی ایک لفظ نہ بول سکا۔

"بچہ بیمار پڑا ہے......دوا کے لئے پیسہ نہیں ہمرے پاس" اُسکی متانت بھری آواز۔ میں نے اپنے چہرے کا بدلتا ہوا تاثر محسوس کیا......سو کا نوٹ میرے پرس سے اُچھل کر اُسکے ہاتھ میں آیا۔ تشکر سے اُسکی نظریں جھک گئیں۔ اپنا کوئی سمجھ کر دھیمی آواز میں کچھ ایسا سنائی دیا "صاحب......میں کہیں چلنے کے لئے تیار ہوں۔"

وہ پھٹے پرانے خیموں کی طرف تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی چل پڑی۔ اچانک سوموگاڑی دھول اُڑاتی ہمارے درمیان حائل ہوتی ہوئی گزر گئی۔ وہ گرد و غبار میں ایسے غائب ہوگئی جیسے کالے گھنیرے بادلوں میں چاند چھپ گیا ہو۔

دوسرے دن میں دفتر سے قبل از وقت نکلا۔ دو تین بلڈنگیں چھوڑ کر اُس خیمہ زن میدان کی جانب نگاہ دوڑائی تو مجھے دور سے ہی وہاں پر ایک چھوٹا سا ہجوم نظر آیا۔ بھیڑ مشتعل تھی۔ سات آٹھ آدمی آپس میں گالی گلوچ کر کے اپنی مردانگی کا اظہار کر رہے تھے اور کئی راہ گیر اُن کا تماشہ دیکھ کر محظوظ ہو رہے تھے۔ کس کی مجال کہ سانپ کے بل میں ہاتھ ڈالتا......بیچ بیچ میں خیموں سے بھی کئی نسوانی آوازیں اُبھرتیں۔ وہ اپنے انداز کی گالیوں سے اپنے مردوں کے حوصلے بڑھا رہی تھیں۔ کئی شریف لوگوں نے ناک بھوں چڑھا کر کھسک جانے میں عافیت سمجھی......اس دوران وہ بھی ایک خیمے سے باہر نکلی۔ اُسے دیکھتے ہی بوڑھا بھکاری چیخ پڑا......پاس ہی درخت کے نیچے سلگتا ہوا ایک شعلہ بھڑک اُٹھا۔

''حرام زادی...... بچہ چاہئے ...... بھوک سے مرا وا دیا''

بات سنتے ہی میرے قدم ساکت ہو گئے۔ میں خلاف توقع اندر ہی اندر تلملا اُٹھا۔ بچے کی موت کی خبر کانوں میں پڑتے ہی افسوس ہونے لگا۔

''کیوں ...... کیا دودھ نہیں پلایا۔ دوا دارو نہیں کی ...... اس نے کیا کمی رکھ چھوڑی'' کبڑا آدمی طیش میں آ کر اُس کی طرفداری کرنے لگا۔ وہی اُسکا ساتھی بھکاری کبڑا جو ریڈی میں اوندھے منہ پڑا رہتا تھا۔

''سالی ...... ڈاکٹر کے پاس لے گئی تھی؟'' اس کا دوسرا سوال جیسے ایک اور شعلہ بھڑکا ہو۔

''ہاں ہاں ...... لے گئی تھی ...... کتنی بار کہہ چکی ہوں''

''پھر اچھا کیوں نہیں ہوا؟'' ایک اور سر پھرا سوال۔

''میں کوئی وید ڈاکٹر نہیں ہوں ...... بھگوان پہ بھروسہ رکھ بوڑھے'' معقول جواب تھا۔

''جھوٹ بولتی ہے ...... حالت اتنی خراب ہے ...... بھگوان کو کیوں گھسیٹتی ہو'' اب بوڑھے سے رہا نہ گیا۔

''جھوٹے مکار۔ روج روج کوئی نہ کوئی بہانہ بناتے ہو۔ بچہ نہیں دینا ہے، مت دو۔ اپنا تین سو روپیہ خرچ کیا ہے ...... نخرے کرنے لگا ہے اب تو ......'' وہ بپھری شیرنی کی طرح اُس پر جھپٹی۔ اُس نے زور زبردستی سے ہاتھ چھڑا لیا۔

''ایسی بک بک کرتی رہو گی تو مجھے اپنا بچہ واپس کر دو ...... اگریمنٹ ختم سمجھو آج سے ......'' وہ یہ کہہ کر خیمے کے اندر چلا گیا۔

''ہاں ہاں روکتا کون ہے ...... اپنے پلے کو واپس لے لو'' وہ بھی دہاڑی۔

''پاگل ہو گئی ہے سالی ...... دوسرا بچہ کہاں سے لاؤ گی۔'' اب کبڑا آدمی طیش میں آ کر بولا اور ایک تھپڑ اُسکے گال پہ رسید کیا۔

''دوسرا بچہ رجنی، کانتی، شانتی کا ہے'' وہ اپنا گال سہلانے لگی۔

''اُن سے پوچھا ہے کیا؟ یا اپنے ہیجڑے باپ سے......'' کبڑے نے منہ سے گالی اُگلی۔

''کبڑے......ہیجڑا ہوگا تیرا باپ......آج سے تمہاری بھی کٹی۔''

''چپ حرام زادی......شادی کی ہوتی تو آج تیرے اپنے تین تین پلے ہوتے رکمنی۔''

''شادی......تم سے......تم سے کبڑے'' ۰ کبڑا جھینپ گیا۔ اُسکا چہرہ سرخ ہوا خیمے کے اندر سے کسی بوڑھی عورت کی آواز سنائی دی ''کیوں کیا کوئی ہیرو پسند آیا ہے؟''

میں رکمنی کی نظروں میں آنے سے پہلے ہی تیز تیز ڈگ بھرتا ہوا بس اسٹاپ کی جانب چل پڑا......متواتر تین دن چھٹیوں کی وجہ سے دفتر جانے کا سلسلہ بھی بند رہا لیکن تین دن بعد جب میں بس اسٹاپ پہ پہنچا تو مجھے رکمنی جیسی کوئی اپسرا گاڑی کے انتظار میں کھڑی دکھائی دی......میں حیرتوں کے سمندر میں ڈوب گیا...... وہ وہی تھی......آج وہ ایسی نہائی تھی کہ صابنکی ٹکیہ رگڑ رگڑ کر جیسے خود صابن کی ٹکیہ بن گئی ہو......اُجلی، بے داغ......جیسے ابھی ہاتھ لگتے ہی پھسل جائے......

اُسکے قریب پیلی شرٹ میں نیلی نیلی آنکھوں والا نوجوان سگریٹ کے لمبے کش لیتا ہوا آٹو والے سے محو گفتگو تھا۔ فٹ پاتھ پر ایک پرانی اٹیچی اور جین کپڑے کا بیگ جیسے اونگھتا ہوا دکھائی دیا......رکمنی کچھ مضطرب سی لگ رہی تھی اور اُس کی بے چین اور بے قرار آنکھیں اِدھر اُدھر گھومتی ہوئی جیسے کسی کو ڈھونڈھ رہی تھیں اور جوں ہی اُسنے مجھے دیکھا تو جیسے اُسے اپنی تلاش میں کامیابی مل گئی ہو۔ اُسکے رخساروں پہ کچھ اور سرخی نمودار ہوئی اور اُسکے ہونٹوں پہ ایک مسکراہٹ بکھر گئی......وہ آگے بڑھنے کی ہمت نہ کرسکی۔ آنکھوں آنکھوں میں ہی وداع چاہی مجبوراً جواب میں مجھے ادھ مری مسکراہٹ سے اُس کا ساتھ دینا پڑا۔ تب اُسنے نظر کے ساتھ گردن بھی جھکالی۔

منی بس روانہ ہوگئی۔ اپنے پیچھے رکمنی کو چھوڑ کر، میں راستے میں صرف یادوں کے ہچکولے کھاتا رہا...... سارا دن دفتری معمولات میں اُلجھتا رہا۔ اچانک آڈٹ پارٹی کے انسپکشن نے نروس کر دیا۔ خلاف توقع سارے سٹاف ممبروں کو شام تک آفس میں ہی رُکنا پڑا...... دن بھر تھک کر سورج مغرب کی بانہوں میں سما گیا تھا۔ باہر اندھیرا اچھل رہا تھا۔ ہر کسی کو گھر جانے کی فکر تھی۔

رکمنی دو چار روز تک کہیں نظر نہ آئی اور نہ ہی وہ نیلی آنکھوں والا نوجوان...... بنجاروں کی بستی حسب معمول اپنے عالم میں مست۔ نیم برہنہ چھوٹے چھوٹے بچے کھیل کود میں محو...... بھکاری اپنے دھندے میں مصروف...... نہ جانے مجھے ہی رکمنی کی کمی کیوں محسوس ہو رہی تھی۔ گھر لوٹتے ہوئے جوں ہی میں اُس کھلے میدان کے قریب پہنچا تو وہ سارا میدان آج سرچ لائٹس کی روشنی میں جیسے نہا رہا تھا۔ میدان میں پولیس بھی موجود تھی۔

"حوالدار صاب۔ حرام زادی چار روز سے غائب ہے۔ پورا دو ہزار روپیہ لے کر بھا گی ہے۔ سنا ہے صاحب کوئی نیلی نیلی آنکھوں والا نوجوان اُس کے پیچھے پڑا تھا اُسی کے ساتھ بھا گی ہے"، رکمنی کی ماں سینہ کوبی کر رہی تھی۔

"ہم جانتا تھا اُس کے لچھن ٹھیک نہیں ہیں۔ کئی دنوں سے زیادہ ہی نخرے دکھا رہی تھی"، کبڑے آدمی نے اپنا رونا رویا۔

"شادی شدہ تھی یا......" حوالدار کا سوال چونکا دینے والا تھا۔

"کنواری تھی" پاس ہی کھڑے ایک نوجوان نے جیسے سارا بھید فاش کر دیا۔

"چپ رہ سالے..... تم لوگوں سے ایک لڑکی کو قابو میں رکھنا نہیں آتا" حوالدار نے اپنی حوالداری دکھائی۔

"مائی باپ ...... مجھے رُکمنی چاہئے" بوڑھی عورت گڑگڑانے لگی اور حوالدار کے پیروں پہ گر گئی۔

"کہاں تک بھاگ سکتی ہے کمینی ...... ایک دو دن کے اندر دونوں کو پکڑ لینگے"
حوالدار کی بات سے خیموں کی بستی میں جیسے اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔

پوری کہانی بے نقاب ہو چکی تھی جیسے کوئی دوشیزہ باتھ روم میں برہنہ ہوگئی ہو۔اب مجھے دھیرے دھیرے وہ تمام باتیں نہ صرف یاد آرہی تھیں بلکہ منظر منظر ہر ایک کردار کا چہرہ عیاں ہو رہا تھا۔میں خالی خالی نظروں سے آسمان کو تکتا رہ گیا ایسا لگ رہا تھا جیسے بارش شام کی نذر ہو گئی ہو۔ایک بار تو بادل زور سے بھی گرجا، کئی بجلیاں بھی کڑکیں اور میں بس اسٹاپ کی جانب چل دیا۔

دوسرے دن بس اسٹاپ پر جوں ہی میں منی بس سے اُترا تو چند ثانیے تک مبہوت سا کھڑا اُسے دیکھتا رہ گیا۔ اپنی ہی آنکھوں پہ اعتبار نہ آیا، اپنی ہی بصارت پہ ہی شک ہونے لگا۔

رُکمنی آج پھر کسی دوسرے کا بچہ گود میں لئے ریڑی کے قریب کبڑے بھکاری سے کچھ کھسر پھسر کر رہی تھی...... وہی پرانی چال، وہی پرانا انداز، وہی پرانا لب ولہجہ۔البتہ چہرے پر ناکامی اور کچھ زخموں کے نشان صاف دکھائی دے رہے تھے...... یکا یک اُس کی نگاہیں اُٹھیں جیسے وہ گہری نیند سے جاگ رہی ہو۔ مجھے دیکھ کر نہ چونکی، نہ ہڑبڑائی۔بس ایک لمحے کے لئے گردن اور نظریں جھکالیں...... پھر بڑی بے شرمی سے میرے آگے اپنی ہتھیلی پھیلائی، لبوں کو ہلکی سی جنبش دی "صاحب...... ایک روپیہ کا سوال ہے"۔ایسا لگ رہا تھا وہ اپنی لاتعلقی کا اظہار کر رہی ہو۔

میں اُس کے رویے پہ حیران اُسے بس دیکھتا رہ گیا۔

"کہاں بھاگی تھی؟" میرا غیر متوقع سوال سن کر پہلے وہ کسمسائی، پھر بے خوف ہو کر اپنے خول سے باہر آئی۔ "سالا، حرام جادہ...... چار سو بیس نکلا حرامی۔شادی کا بہانہ کیا تھا۔دو چار راتیں مزے سے چاٹتا رہا...... بھوک مٹی تو ردی کاغذ کی طرح سڑک پہ چھوڑ دیا...... سوچا

تھا اس گندی بستی سے مکتی پالوں گی مگر اب تو ہمیشہ کی طرح اسی نالی میں سڑ جاؤں گی۔"

"اب وہ کہاں ہے؟"

"حوالات میں سڑ رہا ہے سالا۔"

"اور تم پھر اسی دھندے میں لوٹ آئی ہو"۔

"کیا کروں صاحب......کوئی نیا ڈھونڈنے میں وقت تو لگے گا ہی نا۔"

اُسکی آخری بات سن کر میرے پاؤں تلے زمین کھسک گئی۔ میں نے غصہ اور نفرت سے بھری تھوک کچی سڑک کے منہ پر ماری اور آج رکمنی کو بنا کوئی سکہ دیئے آگے بڑھ گیا۔

..................☆☆☆..................

اپنا دامن اپنا ہاتھ

بات کیا ہوئی......؟

اچانک بستی میں بات چھپ چھپا کے ایسی بڑھ گئی جیسے تیل نے آگ پکڑلی ہو۔

لوگوں کی دریافت میں آکر ایک چھوٹی سی بات پر ایسا تہلکہ مچا کہ ہر ایک نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے چبادیا۔

بستی کے گلی کوچوں میں عورتوں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں سرگوشیاں کرتی رہیں۔ خوب تذکرہ ہوتا رہا۔ معمولی سی بات ایک کرشمہ ثابت ہوئی۔ ایکا ایکی ایسی بہت سی دبی چھپی کہانیاں ایک ایک کر کے بے نقاب ہوتی رہیں۔ اوباش قسم کے نوجوانوں کے کانوں میں بھی بھنک پڑی۔

باتوں باتوں میں حاجی ملا حسین کی خادمہ تسلیمہ نے بستی کی ایک جانی پہچانی عورت سے بے تکی بات کہی۔ سورج کے ڈوب جانے تک وہ دوسری عورتوں میں پھیلی۔ اُن میں کسی ایک سے بات اڑ کو مسجد شریف میں عشاء کی نماز تک کئی بزرگوں تک جا پہنچی۔ مولوی عبدالرحمان نے اپنے کمرے میں مجلس کے منتخب ممبروں کی ایک ہنگامی مجلس بلائی۔ مجلس کے استقبالیہ کلمات میں مولوی عبدالرحمان نے سنی سنائی کہانی سن کر پر زور لفظوں میں اس غیر اخلاقی فعل وآداب اسلامی کے منافی قرار دیا۔

بظاہر سماجی بہبود کمیٹی کا قیام بستی میں عمل لایا گیا تھا تاکہ رسومات بد کا انسداد کرنے

اور نو جوانوں میں اخلاقی گراوٹ کا سد باب ہو شادی بیاہ کے موقعوں پر نمود نمائش کے مضر اثرات کا قلع قمع کرنے کا ایک دانشمندانہ اقدام تھا۔ البتہ پس پردہ میں شاطر ممبروں کی کوئی کمی نہ تھی، اپنا الو سیدھا کرنے میں ان کی شاطرانہ ذہنیت کا کسی کو پتہ نہیں چلتا تھا۔

مولوی عبدالرحمان بھی ہمیشہ سے اس تاک میں رہتے تھے کہ کب بہتی گنگا میں ہاتھ دھوئے۔ انہوں نے موقع کو غنیمت جان لیا اور ورثہ سے ملی قطعہ اراضی کی برسوں پرانی دشمنی کو آڑے ہاتھوں لیتے ہی موقعے کا فائدہ اٹھالیا۔ یہ سوچتے ہوئے انہوں نے ماسٹر انور علی پر صیغہ راز الفاظ میں حاجی حسین کے پاس اس کے بیٹے کی نازیبا حرکت کرنے کی بات پہنچانے کی ذمہ داری ڈال دی۔

دوسرے دن کوچنگ سینٹر سے لوٹتے وقت ماسٹر انور نے سیدھے حاجی ملا حسین کے گھر کی طرف رخ کیا۔ مزاج پرسی کا بہانہ تراشا۔ باتوں باتوں میں اُسے ایسا الجھا دیا کہ کسی نہ کسی طرح افواہ کی بھنک سے متعلق کچھ جان سکے۔ اُسے اندازہ ہونے لگا کہ ابھی تک بات اس کے کانوں تک پہنچ نہیں پائی ہے۔ شک کو یقین میں بدلتے ہوئے وہ ہمدردانہ لہجے میں گویا ہوا:

''حاجی صاحب۔ سنا ہے کہ کل شام عصر کی نماز سے آپ مسجد شریف میں برابر غیر حاضر رہے۔ خیریت تو ہے۔ مولوی صاحب نے بھی آپ کی طبیعت پر کافی تشویش ظاہر کی ہے۔''

''ہاں بھئی! کل صبح سے سردی سے میرا برا حال ہے۔ رہ رہ کر کھانسی آجانے سے سینے میں کافی تکلیف ہو رہی ہے۔'' ''بالکل درست فرمایا آپ نے۔ دسمبر کا مہینہ ٹھنڈ کا ہوتا ہے۔ لہٰذا آپ جیسے بزرگوں کے لئے باہر نکلنا تکلیف وہ عمل ہوتا ہے''۔

''ہاں۔ میری بات سے اتفاق ہو یا نہ ہو۔ بڑھاپے کی مثال اس پیتل کے برتن جیسی ہوتی ہے جو گرمی سے جلد گرم اور سردی سے جلد ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اس عمر میں معمولی سی ٹھنڈ کیا

لگی تو نزلہ زکام ہو جاتا ہے۔''

''آپ صحیح فرماتے ہیں۔ایسی ٹھنڈ سے اکثر نوجوانوں کے جسم بھی کانپتے نظر آتے ہیں۔ان کی گرمی دھری کی دھری ہی رہ جاتی ہے۔''

کمرے میں دیر تک قہقہوں کی گونج سنائی پڑتی تھی۔

اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔

اتنے میں بانو کلثوم کشمیری چائے سے بھرا سماوار اور گرما گرم ہاتھ سے بنی چپاتیاں بید کی ٹوکری میں لے کر داخل ہوئی۔علیک سلیک کے بعد انکے مدمقابل بیٹھ کے ایک ایک پیالی میں چائے انڈیل کر مسکراتی ہوئی بولی:

''کافی دنوں کے بعد نظر آئے ہیں ماسٹر صاحب۔''اس نے چائے کی ٹرے ان کی طرف بڑھادی۔

''نہیں!نہیں بھابی صاحبہ۔میں ابھی ابھی چائے پی کے آیا ہوں''۔

یہ کیسے ہوسکتا ہے ابھی ابھی آپ سینٹر سے لوٹ آئے ہیں اور پھر باہر اتنی سردی ہے۔یہاں ٹھنڈ محسوس ہوتی ہے۔ایسے میں چائے پینے سے بدن میں تھوڑی سی گرمی آجاتی ہے اور راحت سی ملتی ہے۔''

''کسی دن پی لیں گے انشاء اللہ۔آج جلدی میں ہوں۔سوچا حاجی صاحب کی طبیعت جان لوں۔''

''اس کے لئے شکریہ۔چائے کا ٹائم ہے لہٰذا ہر صورت میں چائے لینی پڑے گی۔''

اس کے ہونٹوں پر پھر ایک خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی۔باوجود اس کے انکار کرنے پر اس نے اس کے سامنے دو گرم گرم چپاتیاں رکھ دیں۔

انور علی نے سنبھل کر کمان سے تیر پھینک دیا۔شاید سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

"آپ نے اتنی تکلیف کیوں کی۔ ملازمہ تسلیمہ دکھائی نہیں پڑتی ہے۔"

"دو دن سے اس کی بیٹی راشدہ کی طبیعت خراب ہے۔ ممکن ہے کل کام پر لوٹ آئے۔"

"کیا ہوا اسے۔ سچ مچ بول کے گئی ہے یا کوئی حیلہ بہانہ......"

"نہیں نہیں۔ وہ ایسی ویسی نہیں ہے۔ بالکل سیدھی سادی عورت ہے۔ یہ بھی پتہ نہیں ہوتا ہے کہ بات کرتے کرتے وہ کیا کہہ رہی ہے۔ کچھ الٹی سیدھی بات کہہ دی اس نے کیا نہیں تو......"

"وہ باتونی ضرور ہے اور تھوڑی بہت بے وقوف بھی۔ کبھی آپ نے......"

وہ اتنا کہہ پائی کہ تیکھی نظروں سے ملا حسین کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ لمحہ بہ لمحہ اس کے شوہر کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات بڑھتے دیکھ کر ہی وہ سماوار اور پیالوں کو سمیٹتی ہوئی کچن کی طرف چل دی۔

اس نے حاجی ملا حسین کو اس درمیان کسی خیال میں کھویا کھویا سا پایا۔

"آپ کس سوچ میں پڑ گئے ہیں حاجی صاحب۔ لگتا ہے مجھ سے کچھ چھپایا جا رہا ہے۔"

اس بار ماسٹر انور علی نے ایک تیر پھینکا۔

"اجی انور صاحب۔ آپ سے چھپائیں کیا۔ میں خود اس سلسلہ میں آپ سے مشورہ لینا چاہتا ہوں۔ ہمارے گھر میں اس وقت مہابھارت چل رہی ہے۔"

"کیا کہا۔ خدا ایسا نہ کرے۔" اس نے تشویش بھری سانس چھوڑی۔

"ہاں بھئی۔ تصدق حسین نے قافیہ تنگ کر رکھا ہے۔ اس کی چشمہ شاہی بنگلہ پر نظر ہے۔ ملک پلانٹ لگانے کا ارادہ ہے۔ میرے ہوتے ہوئے اپنے ملکیتی حقوق کے دستاویزی کاغذات چاہتا ہے۔"

اس کی آنکھوں میں نمی نمودار ہوئی جیسے شدت درد سے دماغ کی نس پھٹ گئی ہو۔

"لیکن اس بات......"

"ملک فیکٹری پر قرضہ لینا چاہتا ہے۔ میرے ہوتے ہوئے مجھے بنگلہ سے بے دخل کر کے بنک کو گروی میں رکھنا چاہتا ہے۔"

"اس سے تمہیں کیا فرق پڑے گا۔ اس ساری جائیداد کا اکلوتا وارث تو وہی ہے۔ آج نہ سہی کل سب اسی کا ہے۔"

"لیکن میرے جیتے جی! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اپنا شال قالینوں کا اتنا بڑا کاروبار پھیلا ہے۔ اب یہ نئی مصیبت......"

"آج کل کے بچے اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہنا پسند کرتے ہیں۔ کھلے ماحول میں آزادی کی سانس لینا چاہتے ہیں۔"

"میں نے کون سی بیڑی پاؤں میں ڈال دی ہے۔" اس کی آواز رندھ گئی۔ تھوڑی دیر تک کھانستا رہا۔ جب سکون پایا۔ تو اپنی بات آگے بڑھا دی۔

"کم بخت! ہفتہ بھر کی مہلت مانگتا ہے، ورنہ طرح طرح کی دھمکیاں دیتا ہے۔ کبھی بھاگنے کی، کبھی فیکٹری کی......"

"جانے دیجئے۔ بچہ ضد کر رہا ہے تو بے ٹوک اس کے نام کر دیجئے۔"

"نالائق کہیں کا۔ احمق! خدا ایسی اولاد دشمن کو بھی نہ دے۔"

"ماں باپ کی نظر میں بچے ہمیشہ چھوٹے ہی رہتے ہیں۔ ان کی ہر حرکت بچکانہ لگتی ہے ہر کام کا انجام ڈر اور خوف سے پریشانی کا موجب بنتا ہے۔"

پل بھر وہ غم واندوہ کا مجسمہ بن گیا۔ بجھی بجھی نظروں سے چھت کی طرف اس بوسیدہ گھونسلے کو گھورتا رہا۔ جہاں ابابیل کے بچے باہر آنے کی ضد کر رہے تھے۔ اسے یاد آنے لگا۔ ماں باہر کے خطرات کو دیکھتے ہوئے ان کو اپنی چونچ سے اندر دھکیل دیتی۔ کھڑکی کے پٹ پر ابابیل بیٹھا متفکر تھا۔

حاجی ملا حسین کو پھر کھانسی کا دورہ پڑا۔ سانس لینے میں سخت دشواری ہوئی۔ شاید دل کے بھاری بوجھ سے یا نتھنوں میں زکام جمنے سے۔

ماسٹر انور علی کافی پریشان اور بے چین تھا۔ اپنے مقصد کے فوت ہونے کا اندیشہ بڑھ گیا۔ گو وقت تیل ملے ہاتھ سے صابن کی ٹکیہ کی طرح نکل رہا تھا۔ وہ کسی نتیجہ پر پہنچ نہ پایا۔

''اب آپ نے کیا فیصلہ لے لیا۔''

''بھئی! میں بے بس ہوں۔ اس کی ماں کی طرفداری کا خیال کرتے ہوئے کچھ نہ کچھ سوچنا پڑے گا۔''

ہارے ہوئے جواری کی طرح اس نے ساری رقم داؤ پر لگا دی۔

''دیر پھر کس بات کی۔'' ماسٹر انور علی نے توقع کے مطابق کہا۔

''ہاں۔ بنگلہ دینے کو تیار ہوں۔ تھوڑی بہت ہٹ دھرمی سے کام لینا پڑتا ہے۔ جیسے گرم لوہا آہستہ آہستہ بالآخر ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔'' اس کے چہرے کی جھریوں سے پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''شادی کی بات کیوں نہیں چلاتے ہو۔ کہیں عشق کا چکر تو نہیں چل رہا ہے۔''

ماسٹر انور علی نے اپنا آخری تیر نشانہ پر مار دیا۔

''شادی.........وہ ایک دن ہو کر رہے گی!''

''بھئی! ہم بوڑھے ہیں۔ اب تو اسی کی باری ہے۔''

''کہیں عشق تو نہیں لڑا رہا ہے صاحبزادہ۔ اور تجھے اس کی خبر نہیں۔''

ایک بار پھر قہقہوں کی ہلکی سی بارش ہوئی۔

'' لگتا ہے آپ کچھ چھپاتے ہو۔ ایسی بات ہے تو صاف صاف سیدھے طور کہہ دو۔''

اچانک حاجی ملا حسین ایسے چونکے جیسے نیند میں اس پر بالٹی بھر پانی ڈال دیا گیا ہو۔

”کچھ ایسا ہی سننے میں آرہا ہے۔“ انور علی نے کہا۔

”بتاؤنا بات کیا ہے۔“

”بستی میں افواہ گرم ہے کہ تصدق حسین کا ایک نقاب پوش لڑکی سے معاشقہ چل رہا ہے۔ تین چار بار نہرو پارک اور کبھی آثار شریف حضرت بل کے قریب دیکھے گئے ہیں۔“

ماسٹر انور نے جنگ کا بگل بجایا اور اسے پوری بات واضح کرنے کا موقع ملا۔

”ماسٹر صاحب! ایسا میں پہلی بار سن رہا ہوں۔ لاحول ولاقوۃ ......“ اس نے تشویش بھرے انداز میں بات جاری رکھی۔ ”یہ عشق کا کون سا چکر ہے۔ بھئی! معشوقہ کون ہے؟“

”کچھ کہا نہیں جاسکتا۔“ ماسٹر انور نے جواب دیا۔

”لگتا ہے یہ سب الزام تراشی ہے۔ ایسا تو نہیں میرے بیٹے کے خلاف کوئی گھناؤنی سازش ہو رہی ہو۔“

وہ آگ بگولہ ہو گیا۔ کنپٹی کی رگیں پھڑ پھڑانے لگیں۔ پھر آوارہ بادل جیسا گرج پڑا:

”اگر ایسی ویسی بات ہوتی تو بیگم نہ سہی۔ تسلیمہ ضرور بتا دیتی۔“

”دیکھئے حاجی صاحب۔ میں اپنی مرضی سے نہیں آیا۔ مولوی عبدالرحمان نے تاکید کر دی تھی کہ اصلیت کا پتہ لگاؤں۔“

”اوہو۔ بات یہاں تک پہنچی ہے۔“

”ہاں۔“

”یہ سب من گھڑت الزام اور سراسر جھوٹ ہے۔ میں اپنے بیٹے کو خوب جانتا ہوں۔ اور کیا سنا ہے۔“

”اتنا معلوم ہوا کسی نقاب پوش لڑکی سے اکثر ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ ممکن ہے بات میں دم ہو۔ بیٹے سے پوچھنے میں کیا برائی ہے؟“

”بات کس نے اڑائی ہے کچھ پتہ چلا؟“

''کوئی گھر کا بھیدی ہی لگ رہا ہے۔ کسی نے رنگے ہاتھوں دیکھ لیا ہوگا بدنامی کے خوف سے اپنا نام ظاہر نہیں کرنا چاہتا ہے۔'' ماسٹر انور کی وضاحت میں دلیل تھی۔

''اب کیا کیا جائے۔ آنے دو کمبخت کو۔ خاندان کی بدنامی ایک طرف اور میری عزت کا سوال......ایک طرف

''بات کو زیادہ طول نہ دینا۔ نرمی اور شرافت سے پوچھ لینا۔''

''بھئی۔ میں شادی کے خلاف نہیں۔ شرافت بھی کوئی چیز ہے۔ اسلامی آداب کے مطابق شادی کی جائے۔ انکار کون کرے گا۔ لیکن ایسی آوارہ گردی قطعی برداشت نہیں ہو سکتی۔'' وہ دیر تک بڑبڑاتا رہا۔

ماسٹر انور علی نے جانے کی اجازت مانگی۔ حاجی حسین کمرے سے باہر برآمدے تک اس کے پیچھے پیچھے چلا آیا۔

باہری گیٹ پر تصدق حسین کی ماروتی گاڑی ہارن بجاتی باغ کے الگ گوشے میں کھڑی ہوگئی۔ باہر آکر ماسٹر انور علی پر نظر پڑی۔ اس کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔ جیسے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہو۔ انور علی سے علیک سلیک کیا۔ اس کی آمد پر پوچھے بنا نہ رہا۔

''ماسٹر صاحب! بہت دنوں بعد یاد کیسے آگئی؟''

''کیوں برخوردار! آنے کی کوئی ممانعت ہے؟''

''میرے کہنے کا مطلب ایسا نہ تھا۔ بہت دنوں بعد آئے ہیں آپ۔ کئی بار سوچا آپ سے مل لوں۔ لیکن اسے کہتے ہیں ابھی ہاتھ اٹھے نہیں کہ خدا نے سن لی۔''

''شوق سے۔ اپنے صاحب جیسے ہو۔ وجہ ضرور ہوگی۔''

''ہاں۔ ڈیڈی سے سفارش کی ضرورت ہے۔''

''سمجھ گیا۔ میں وہی بات تم سے جاننا چاہتا تھا۔''

ابھی وہ اپنا پورا جملہ ٹھیک ادا نہیں کر سکا تھا کہ حاجی ملا حسین کی آواز سنائی دی۔

''صاف صاف پوچھو۔ یہ عشق کا کیا چکر چلا رکھا ہے انور علی۔''

''کیا بات ہے؟''

''برخوردار! بستی میں تمہارے خلاف باتیں ہو رہی ہیں۔ تمہارے کسی نقاب پوش لڑکی سے مراسم ہیں۔ کہاں تک صداقت ہے.....؟''

''سمجھ گیا۔ کسی سر پھرے آدمی نے شوشہ چھوڑا ہے۔''

''دیکھو! کھلے عام سڑکوں پر ملنا جلنا اچھی بات نہیں ۔ بزرگ کس کام کے ہیں۔''

''آپ بھی یقین کرنے لگے۔''

''یونہی پوچھا۔''

''اس بات کا آئندہ خیال رکھوں گا۔''

ہونٹوں پر ایک زہریلی سی مسکراہٹ نمودار ہوتے ہی وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ڈرائنگ روم کی جانب چل پڑا۔ دروازے پر ملا حاجی حسین اور ماسٹر انور علی ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ گئے۔ جیسے دو بلیوں کے درمیان پنیر کا ٹکڑا کوئی چیل لے اڑی ہو۔

''حاجی صاحب کوئی بات نہیں۔! اکثر جوشیلے نوجوان ایسے ہی ہوتے ہیں۔ پھر کسی دن بنا پوچھے دستک دیتے ہوئے چلا آؤں گا۔''

سردی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ حاجی حسین کی صحت بھی روز بروز بگڑتی جا رہی تھی۔ موت کے بعد اس ساری جائداد کا وارث وہی ہے، یہ سوچتے ہوئے آخر اس نے چشمہ شاہی کا بنگلہ تصدق حسین کے نام کر دیا۔ دستاویزی کاغذات مکمل ہوئے۔ جیتے جی وہ خود اپنے بنگلہ سے بے دخل ہو گئے۔ آخر بیٹے کی ضد کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔ بنک سے قرضہ کے عوض میں بنگلہ گروی رکھنا اچھا نہ لگا۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ اس نے بھی جوانی میں آبائی پیشہ کو چھوڑ دیا تھا۔ اپنے باپ کی مرضی کے خلاف اس نے اپنے من پسند کام میں لاکھوں روپے کمائے تھے۔ شاید یہ اسی کی سزا ہے۔ پدرانہ شفقت کی کوئی نس پھڑک اٹھی۔ کہیں وہ اس

سے زیادہ کچھ کر کے نہ دکھادے۔

صرف ایک بات پھوڑے کی طرح اس کے ذہن کو تکلیف دے رہی تھی وہ تھی تصدق حسین کی شادی......؟

حاجی ملا حسین نے کہا۔

''بیٹے! میری خواہش ہے اب تم شادی کر ڈالو۔ میری نظر میں ایک اچھی لڑکی ہے۔ شرافت میں اور خوبصورتی میں بھی۔

''میں نے لڑکی دیکھ لی ہے۔'' کسی اوباش لڑکے کی طرح اس نے اپنی رائے ظاہر کر دی۔

''لیکن......'' حاجی ملا حسین کی آواز رندھ گئی۔ اس سے قبل کہ وہ کچھ اور کہتا تصدق حسین نے اسے لقمہ دیا:

''میرے معاملات میں کوئی دخل نہ دے۔ بہتر یہی رہے گا۔''

''شادی کس سے ہو رہی ہے۔ اتنا تو بتادے۔''

''کوئی فائدہ نہیں۔ بعد میں سب پتہ چلے گا۔''

''دستور کے مطابق خاندان، شرافت اور بھی کئی چیزوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔''

''لیکن میں ایسی واہیات باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔ لڑکی اچھی ہے۔ خوبصورت ہے۔ خدمت گزار ہے اور خاندان بھی ماشاءاللہ اچھا ہے۔''

وہ بے پرواہ کچھ اس طرح کہتا رہا کہ اس کی باتوں سے حاجی ملا حسین اپنے سینے پر جیسے سانپ رینگتے ہوئے محسوس کرنے لگا۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ البتہ برابری میں ہونا چاہیئے۔ خاندانی وقار کا سوال ہے۔''

''ایسا ہی ہوگا۔'' حاجی ملا حسین کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے ٹپک کر مٹھی بھر داڑھی میں جذب ہو گئے۔

کئی سرد راتیں اور کئی سرد بوجھل دن چٹکی میں گزر گئے۔ آہستہ آہستہ حاجی ملا حسین کی طبیعت روز بروز ٹھیک ہوتی چلی گئی۔

آج ہلکی ہلکی سی بارش ہو رہی تھی۔ حاجی ملا حسین گرم کپڑوں میں ملبوس ہاتھ لاٹھی کا سہارا لئے ماسٹر انور علی کے کمرے کے باہر دستک دیتے ہوئے موجود پائے گئے۔ اس کے چہرے پر مایوسی کی چھاپ اس قدر گہری ہوتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی گویا وہ کسی قبرستان سے بھاگ کر آیا ہو۔ دبی دبی سی آواز میں کچھ سنائی دے رہا تھا۔ "سنا ہے ماسٹر! تصدق حسین نے مولوی عبدالرحمان کی بیٹی سے کورٹ مریج کر لی ہے۔ اس وقت وہ دونوں چشمہ شاہی بنگلہ پہ موجود ہیں۔"

"میں نے بھی ایسا ہی سن لیا ہے اور میں آپ ہی کے پاس آنے کی تیاری کر رہا تھا۔ کیا نقاب پوش لڑکی وہی تھی۔" "ہاں۔ انہوں نے مجھ سے یہ بات چھپا دی تھی۔ خدا خیر کرے رحمان میاں موذن کا۔ جس نے یہ بات بتادی۔"

"چشمہ شاہی کا بنگلہ......اب رسوائی اور بدنامی......"

"بالکل نہیں ہوگی۔ مولوی صاحب نے بات سنی ہوگی۔
آپ جلدی سے کپڑے بدل دیجئے۔ ہمیں وہاں جانا پڑے گا۔"

"لیکن کیوں؟"

"آپ فوراً تیاری کر لیجئے نا! مولوی عبدالرحمان کی بیٹی کی شادی تصدق حسین سے ہو چکی ہے اور اب راشدہ کی شادی تمہارے بیٹے ارشد میاں سے ہو رہی ہے۔"

"حاجی یہ سب جھوٹ ہے! تمہیں کس نے بتایا ہے؟"

"خدا خیر کرے رحمان میاں موذن کا۔ جس نے یہ بات بتادی۔"

حاجی ملا حسین اسی لب و لہجے میں بولتا رہا۔ قبل اس کے ماسٹر انور کچھ اور بولتا وہ تعجب و استعجاب سے ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ گئے۔

سبقت

برتھ ڈے پارٹی میں ان دونوں کے جانے کا پروگرام تھا۔

لیکن اُسے تبادلہ کا پروانہ مل گیا۔ کل ہی دوسری جگہ جوئین کرنا تھا۔ موڈ خراب ہوگیا۔

''اب کیا کیا جائے۔ نہ جانے سلیم مرزا کیا سوچے!''......انور علی کو یہ سب اچھا نہ لگا۔ وہ دل ہی دل میں کھول کر رہ گیا۔ کچھ کھو دینے کا احساس بُری طرح کھٹکا۔ مایوسانہ لہجہ میں اُس نے پوچھا۔

''کوئی اچھا سا بہانہ ڈھونڈ لیتے ہیں۔'' وہ مسکرائی اور اس کی ڈھارس بندھائی۔

''وہ میرے بس میں نہیں۔ ٹرانسفر نے مجھے اڑچن میں ڈالا ہے۔''

''گبھراؤ نہیں۔ وہ میری مٹھی میں ہے۔ وہ جھٹ بول پڑی ''اتنا نہیں پوچھو گے کہ میں نے کیا بہانہ سوچا ہے۔''

''جانتا ہوں۔ تمہاری طرح وہ بھی بالکل خوبصورت ہوگا۔'' اس نے ایک دبا دبا سا قہقہہ لگالیا۔

''ایسا لگتا کہ تمہارے اندر کا شیطان بولنے لگا ہے۔''

''تم نے حالت کا صحیح اندازہ لگالیا اب اس پر ترس کھاتی ہو۔''......اس پر دونوں کھکھلا کر ہنس دیئے۔

سنگار میز کے آئینے میں ہلکے سنہرے بالوں کو باندھتی ہوئی اس نے شرارت سے آنکھ ماری۔ پھر کسمساتی ہوئی شباب بدن کی نمایاں گولائیوں پر اپنی ساڑھی پھیلا کر اُس کا منہ تکنے

لگی۔

غزالہ پہلے سے بھی حسین اور دلکش معلوم ہو رہی تھی۔ اُس نے آرائش و زیبائش میں کوئی کوتاہی نہ چھوڑ دی تھی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ سطح آب پر پھسلتی کشتی کی طرح اس کے سینے سے جا لگی۔ ایک خزانہ ہاتھ آیا۔ جانے کتنی دیر تک وہ اُسے بوسے ثبت کرتا رہا۔

بچپن سے سلیم مرزا کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے۔ ایک ساتھ بڑھے پڑھے۔ ایک ساتھ کالج آگئے۔ شروع شروع میں ایک ہی کلاس میں سائنس کا مضمون تھا۔ بدقسمتی آڑے آئی۔ اتفاق اسے انور علی ٹائیفائیڈ کا شکار ہو گیا۔ دو ماہ تک غیر تسلی بخش حاضری رہی۔ سائنس چھوڑنا پڑی۔ بڑی مشکل سے کامرس مضمون میں جگہ مل گئی۔ جسکا اُسے بڑا دکھ تھا۔

وقت پر لگا کر اڑا۔ سلیم مرزا نے انجینئری میں ڈپلوما پاس کیا۔ ایک اچھی کمپنی میں نوکری مل گئی اور شہر میں آگیا۔ انور علی کی حالت ذرا مختلف تھی۔ وہ عارضی بنیاد پر کالج میں لیکچرار تعینات ہو گیا۔ بوڑھے والدین کے سوا اُس کا ایک کام چور نکما اور اوباش بھائی تھا۔ ایک بار گھر سے غائب ہوا کہ دوبارہ دکھائی نہ دیا۔ چھوٹی بہن میٹرک امتحان میں دو بار فیل ہو چکی تھی۔ سارا دن رسوئی میں جٹی رہتی تھی۔

ملازمت کے پانچ سالوں میں اس کے ابو جان نے داعی اجل کو لبیک کیا۔ تھوڑا عرصہ ہوا۔ اس نے بیمار بیوی کو اپنے پاس بلایا۔ اب گھر میں جوان بہن برہنہ تلوار کی طرح کھڑی تھی۔ تھوڑی سی زمین فروخت کر دی۔ اس کا سرپنچ بیٹے سے بیاہ رچایا۔ پھر گاؤں میں ساری املاک بیچ ڈالی۔ غزالہ سے شادی کی۔ اور اُسے ساتھ لئے شہر کے ایک متوسط علاقہ کے فلیٹ میں منتقل ہو گیا۔

سلیم مرزا کے گھر پر پارٹی تھی۔ ان کے نور چشم شکیل کی دسویں سالگرہ تھی۔

حسب معمول تزک و احتشام کے ساتھ منانے کا پروگرام تھا۔ بہت سارے جانے پہچانے مدعو کئے گئے۔ مگر آج وہاں صرف غزالہ اکیلی ہی جا رہی تھی۔ وہ اسے تحفہ دینا

چاہتی تھی۔

انورعلی بڑی عجلت میں تھا۔دوتین دکانوں کے چکر کاٹے۔کالج جانے میں دیر ہوگئی تھی۔ اِس بار اس نے بطور گفٹ ایک اچھوتا قیمتی چینی ساخت کا موبائیل خریدا۔خوشنما سنہرے رنگ کے ڈبے میں پیک تھا۔قبل اس کے دوسرے سالوں کی نسبت ایسے موقعوں پر اس کی خریداری معمولی نوعیت کی ہوا کرتی تھی۔لیکن ڈاکٹر شہاب کی پارٹی میں وہ بوکھلا کر رہ گیا تھا۔راتوں کی نیند خراب کردی تھی۔

جس مقصد کو طویل مدت تک اپنے سینے میں دفن کر رکھا تھا۔وہ آج پورا کرنے کا خواہاں تھا۔دیکھا دیکھی کتنی بُری بات ہے۔ ہر چند کسی نے اس پر کبھی یہ سوچا نہیں نہ اس کی طرف کوئی دھیان دیا۔مغرب کی تقلید میں ہم نے مشرقی آداب کو یکسر بھلا دیا۔آج فلم وٹیلی ویژن نے لوگوں کو بے بہودہ رسموں اور برائیوں میں مبتلا کردیا۔یہ کسی کو نہیں معلوم کہ ہماری منزل کہاں ہے۔اس کے سر پر بھوت چڑھ کر سوار ہوگیا۔

صبح تڑکے جب آنکھ کھلی تو نئی جگہ نئے ماحول میں جانے کا خیال آیا۔اُسے بہت دور جانا تھا۔کپڑے بدلے۔جاتے جاتے غزالہ کو سختی کے ساتھ تاکید کردی۔"سنبھل کر جانا۔منا اور رام سروپ کو اپنے ساتھ لے جانا۔روانگی سے پہلے میرے فون کا انتظار کرنا۔"......اُسے لوگوں پر غصہ آگیا۔کہ ایسی ہوا کیا چلی اب شام کے وقت ایک اکیلی عورت تنہا بس میں ہو یا ٹیکسی میں سفر کرنا بہت دشوار ہوگیا شام کو انورعلی اپنے چھوٹے پریوار کو خود اپنی مرسیڈی کار میں لے کر آگیا۔

رات بستر پر دونوں میں خوب باتیں ہوتی رہیں۔ایک ایک بات کی کھال اتار لی گئی۔دونوں کے دل بلیوں اچھلنے لگے۔اس دفعہ اُن کا گفٹ آئیٹم سب پر حاوی رہا تھا۔

سلیم مرزا۔اس کی بیوی اور ڈاکٹر شہاب منہ تکتے رہ گئے تھے۔دراصل انورعلی کی ہمیشہ سے یہ بڑی کمزوری تھی کہ وہ دوسروں کو نیچا دکھانے کے خواب دیکھا کرتا اکثر بڑبڑاتا"

ہم چوں من دیگرے نسیت (مجھ جیسا اور کوئی نہیں ہے)۔

رات گئے تک اب انہیں اپنی فکر ستا رہی تھی۔ دونوں نے مل کر سالگرہ پر تانا بانا جوڑنا شروع کر دیا۔ ایک نئے خواب نے جگائے رکھا اسکا مضمحل سا چہرہ کھلنے کا کھلا رہ گیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد منا کا جنم دن تھا۔ ساری تیاریاں پورے زوروں پر تھیں۔ کارڈ چھپے بٹے۔ اب صرف ایک ہفتہ کا وقفہ رہ گیا تھا۔

غزالہ کو یہ سب کچھ اچھا نہیں لگا...... آنے والے لمحوں کا ادراک محسوس کرتی۔ شکایتی بھرے لہجے میں پوچھا۔

"کاہے۔ اتنی رقم پانی کی طرح بے دریغ لٹاتے پھرتے ہو۔ فضول خرچی کی بھی کوئی حد ہے۔"

"ارے پگلی۔ تم کب سے سمجھنے لگی ہو۔ کبھی تیل کی بجائے گھی سے بھی کام لینا پڑتا ہے مجھ سے رہا نہیں جاتا۔ میرے سامنے سلیم مرزا یا شہاب کی اوقات ہی کیا؟ اس دھوم دھام سے مناؤں گا کہ سارے لوگ دیکھتے رہ جائیں گے"۔

"ذرا سوچو۔ ان کے گھر میں گنگا بہتی ہے۔ انجینئر صاحب جو ٹھہرے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔"

"مانا کہ ان کے گھر میں دولت کی ریل پیل ہے مگر سب حرام کمائی ہے مزید دو تین ٹیوشن کر لوں گا تو سارا کھان پان نکل آئے گا۔"

"آپ کی جو مرضی وہ کر لو۔" غزالہ تنک کر بولتی ہوئی باہر باغیچہ میں آگئی۔ باغیچے کی کھلبلی اور ہلچل میں اُلجھ کر رہ گئی۔

جب پارٹی اختتام پذیر ہوئی تو میز پر طرح طرح کے گفٹ پیکٹوں کا ڈھیر لگ گیا تھا۔ مذاق اڑانے والی بات ایک اعلیٰ نسل کا ایلسشن کتا میز کے نیچے بے سدھ پڑا سویا تھا۔ دیکھتے ہی اُسے ایک دھچکا سا لگا۔ اس کا من پراگندہ اور پریشان ہو گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے

اس خیال کو کہ اپنے ذہن سے نکال دیا۔ یہ سوچ کر کہ وقت انسان کو وہ سیکھا دیتا ہے جو اس نے کتابوں سے نہیں سیکھا ہے اس نے مرزا سلیم کا حقیر سا تحفہ بخوشی قبول کر لیا۔

صبح صادق انور علی سیر کرنے کا عادی تھا۔ اب پچھلے کئی مہینوں سے اسکے پیچھے پیچھے ٹائیگر اُچھلتا کودتا پھاندتا اور دوڑتا ندی کے اُس پار تک چلا آجاتا۔ راستے میں آوارہ کتوں پر بھونکتا۔ گھنی جھاڑیوں اور سوکھے پیڑوں کو ہر دم سونگھتا رہتا۔ سامنے آجاتا۔ ہر وقت اپنی دم ہلاتا رہتا دن بھر رام سروپ کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ بازار سے سودا سلف لاتے وقت گھوم پھیر کر آجاتا ۔

شام کو غزالہ اور منّا کی ربر گیند سے خوب کھیلتا۔ بار بار بال پھیکنا اور واپس آکے پاؤں کے نیچے ڈالتا۔ محلّہ کے چند چھوٹے بچے بھی وہاں آکر لطف اندوز ہوتے ہر ایک کی دل بہلائی ہو جاتی تھی۔ رات کو رکھوالی کا کام بھی بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتا تھا۔

دن گزرتے گئے۔ پہلے محلے کے آوارہ کتے اسے دیکھ کر کاٹنے دوڑنے چلے آتے یا بھونکتے بھونکتے دُور تک اس کا پیچھا کرتے لیکن اب وہ ایک دوسرے سے اتنے مانوس ہو گئے کہ انہوں نے نہ صرف بھونکنا ترک کر دیا بلکہ ایسا یارانہ ہو گیا کہ وہ دیوار پھاند کے یا کبھی گیٹ کا دروازہ کھلا پاتے بے خوف اندر جا گھستے۔

ایک دن کچھ ایسا ہوا۔ رام سروپ اچھا موقع پا کر گھر سے تمام نقدی و زیورات سمیت نو دو گیارہ ہو گیا۔ پولیس میں ضابطے کے تحت رپورٹ لکھوائی گئی۔ تین چار مشتبہ جگہوں پر چھاپہ مارا گیا۔ ہر بار پولیس کو مایوسی ہوئی صرف اتنا ہی معلوم ہوا کہ اس سازش کے پیچھے جھگی بستی کے بدنام زمانہ غنڈا منوہر لعل کا ہاتھ تھا۔ تین سال کی بات ہے جب ایک شناسا نے رام سروپ کو اس بستی سے اٹھا کر انور علی کے گھر میں منتقل کر دیا تھا۔

اس واردات نے غزالہ کے دل و دماغ کو بُری طرح جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔ وہ برداشت نہ کر سکی۔ تھوڑے عرصے میں عارضہ قلب میں مبتلا ہو گئی۔

کئی دنوں سے انور علی کو احساس ہونے لگا کہ اب ٹائیگر اکثر موقع پاتے گھر کے باہر آوارہ کتوں سے میل جول بڑھاتا کئی کئی دنوں سے غائب رہتا۔ گھر میں ہو یا باہر مہمانوں کا ایک تانتا بندھا رہتا۔ کوئی روک اس پر کارگر ثابت نہ ہوئی۔ اپنی اوقات پر آ گیا۔

اِدھر کچھ دنوں سے اچانک منّا کی طبیعت اچاٹ ہوگئی۔ اسکولی کتابوں سے زیادہ محلّہ کے آوارہ بچوں میں دلچسپی لینے لگا۔ غزالہ کو ہر وقت اپنی انگلیوں پر نچانا انور علی کی ناک میں دم کر رکھا تھا۔

کافی سوچ و بچار کے بعد انور علی نے فیصلہ لے لیا۔ انور علی کو جس قدر غم تھا اس سے کہیں زیادہ خوشی تھی۔ کتے کی آوارہ گردی اور بیہودہ حرکتوں سے ایسا سبق ملا کہ منّا کو بُری صحبت سے نجات دلانے کے لئے ایک بورڈنگ اسکول میں داخلہ کرا دیا۔

مرزا سلیم اور ڈاکٹر شہاب کو اعتراف کرنا پڑا کہ اس معاملے میں وہ ایک قدم آگے سبقت لے گیا ہے۔

..................☆☆☆..................

سم کارڈ

بنک کیشر نے دس دس ہزار روپیوں کی دو اجلی اُجلی گٹھریاں اس کے ہاتھ میں تھما دیں اور ایک ان پیڈ چیک بھی یہ کہہ کر واپس کر دی کہ کھاتے میں اتنی رقم موجود نہیں۔ بڑی احتیاط سے اپنی واسکٹ کے دائیں جانب اندرونی جیب میں ڈال کر بڑی عجلت سے باہر نکل آیا۔ اور تیز تیز قدموں سے منی بس اڈے کی جانب چل پڑا۔

رش کافی تھا، گہما گہمی صاف نظر آ رہی تھی۔ مسافر بسوں میں چڑھنے میں مشغول تھے۔ البتہ کئی مضمحل چہرے بے صبر دکھائی پڑ رہے تھے۔ غصہ سے ان کی ناک بھوں چڑھی تھی۔

کھڑی بسوں کے گرد کئی چکر کاٹ کر اُسے خیال آیا۔ آٹو رکھشا کو پکڑنا چاہیئے! فضول خرچی سمجھ کر اپنا ارادہ بدل دیا۔

اچانک سروس بس آتے دیکھی تو تیزی سے اس کی طرف لپک گیا۔ بس پہلے ہی پر تھی کوئی خالی سیٹ نہ پائی کھڑا رہنا ہی غنیمت جان لیا۔ دیکھتے دیکھتے منی بس سواریوں سے کچھا کھچ بھر جانے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ تل دھرنے کی جگہ نہ رہی۔ پائیدان پر کھڑا کنڈیکٹر بار بار اگلے اسٹاپوں کے نام کی رٹ لگا رہا تھا۔ مزید سواریاں اندر ٹھونسنے کا عمل جاری رہا۔

اس کی بغل میں کھڑا ایک لحیم شحیم اور تندرست و توانا نوجوان تھا۔ کافی ہشاش وبشاش نظر آ رہا تھا۔

سواریوں کا برا حال ہو گیا تھا۔ پسینہ کی بدبو پھیل رہی تھی۔ انجن اسٹاٹ ہوا۔ تب منی بس کچھوے کی رفتار سے آگے کھسک کر اڈے سے باہر نکل آ گئی۔ تازہ ہوا کے تازہ جھونکے آئے کہ سواریوں نے راحت کی سانس لی۔ ابھی تک کنڈیکٹر چلا رہا تھا سواریاں کھڑکی کے

باہر لنگوروں کی طرح لٹکتے ہوئے نظر آرہے تھے۔

دھکم پیل قوت برداشت سے باہر چہرے پر ناگواری کے اثرات صاف نمایاں تھے۔

ضبط سے کام لیتے ہوئے۔

''بھئی! تھوڑی سی جگہ چاہیئے ...... پلیز ذرا پیچھے ہٹیے۔

بس نے اپنی رفتار پکڑ لی۔

وجیہہ نوجوان اس سے مخاطب ہوا۔

''کتنے لاپرواہ ہیں بھیڑوں کی طرح لادو یئے گئے ہیں۔

''کوئی نہ کوئی مجبوری ہوگی۔'' اُس نے مختصر سا جواب دیا۔

''یہاں ہر کسی کو ہر وقت جلدی رہتی ہے۔ دوسری بس میں بیٹھ نہیں سکتے۔''

''دوسری بس کا بھی یہی حال ہوگا۔''

یہاں کا بابا آدم ہی نرالا ہے۔ اس شہر میں سب کچھ نرالا ہے۔ تعجب ہے کوئی پوچھنے والا نہیں۔

''ٹریفک حکام کی لاپرواہی ہے۔''

''انہیں کیا پڑی ہے۔ ملائی کھانے کی عادت جو پڑ چکی ہے۔''

بس میں سواریاں ایک دوسرے کے ساتھ چمٹی تھیں۔ کوئی بس کو اور کوئی ڈرائیور کو کوس رہا تھا۔ کوئی سیاست کو اور کوئی ٹریفک اہلکاروں کو موردالزام ٹھہر رہا تھا۔

اس دوران وہ پل بھر بھی غافل نہ رہا۔ اُس کا داہنا ہاتھ جیب کے اوپری حصہ پر فیکول کی طرح جیسا لگا رہا۔

اگلے اسٹاپوں پر ایک ایک کر کے سواریاں اترنے لگیں۔ تب کنڈیکٹر سواریوں سے کرایہ وصول کرنے لگا۔ اپنی اپنی جیبوں سے کرایہ نکالتے وقت ان میں تھوڑی سی ہلچل مچی۔

اس اثناء میں انجان انگلیوں کی لمس سے وہ ٹھٹھک کر رہ گیا۔ اب ساری حقیقت

سامنے کھلی کتاب جیسی پڑی تھی۔ محتاط رویہ اپنا کر خاموش رہا اور اس سے جان چھڑانے کی فکر کرنے لگا۔

کنڈیکٹر اپنے کام سے فارغ ہوکر اپنی جگہ پر آ گیا تھا۔ اس دوران اور کئی سواریاں اتر گئی تھیں۔ ان میں وہ وجیہ نوجوان بھی شامل تھا۔ اترتے وقت اس کی طرف آخری نگاہ ڈال کر اپنے دانتوں تلے ہونٹ داب لیا۔

اس کے بس سے اتر جانے کے بعد اُس نے تھوڑی سی راحت محسوس کی جیسے بھاری بوجھ سے چھٹکارا ملا۔ ہو راستے میں جو بات زیادہ ناگوار گزری وہ موبائیل فون کی بے ہنگم آواز اُسے محسوس ہو رہی تھی۔ بار بار کسی نہ کسی جیب سے مختلف ٹیون نکلتی۔ موبائل فون پر باتیں سوال و جواب عجیب سے لگتے۔ زیادہ تر نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی باتیں اپنی طرف متوجہ کر رہی تھیں۔ فلمی انداز میں ڈائیلاگ بولنے کا انداز نظر انداز کر کے وہ اندر ہی اندر گھل رہا تھا۔

ایک بار پھر اُسی جھٹکے کا سامنا کرنا پڑا۔ واسکٹ کے اوپری حصہ پر اس کا ہاتھ گویا گھڑے میں کسی کھوئی ہوئی شے کو ٹٹول رہا تھا۔ یہ وہی معمر شخص تھا جو کچھ ساعت پہلے ان کی گفتگو کا تیسرا کردار بن چکا تھا۔ اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجی ایک کے بعد ایک کا سامنا کرتے ہوئے اُسے ایسا محسوس ہونے لگا معمر شخص اس جیب کترے کا دوسرا ساتھی ہے۔ اس کے جی میں آیا کہ وہ چیخ چیخ کر بتادے۔ نہ جانے وہ ایسا کہہ نہ سکا۔ کیونکر بزدلی آڑے آئی یا کورٹ کچہری گواہی کے چکر سے اجتناب کا خیال کیا۔ گھر کا آدھ کیلو میٹر فاصلہ پیدل طے کرنے پر اکتفا کر لیا۔ اگلے سٹاپ پر بڑی سرعت سے باہر نکل کر سڑک پر آیا۔ تیز تیز قدم ابھی آگے بڑھا ہی رہا تھا کہ عقب سے کوئی پکارنے لگا۔ کوئی اجنبی مخاطب ہو کر کہہ رہا تھا۔

بھائی صاحب! پاس والی گلی میں کوئی جانا پہچانا آپ کو بلا رہا ہے۔''

''کون ہو سکتا؟ وہ اپنے آپ بڑبڑایا۔

غیر ارادی طور پر اس کے بھاری بوجھل قدم گلی کی جانب مڑ گئے...... چند گز آگے بڑھا تو وہ دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ جیسے زمین کے اندر دھنس گیا ہو۔ اُسے یاد آیا۔ سامنے دو مشتبہ آدمیوں سے آمنا سامنا ہوا جو یکے بعد دیگرے منی بس میں سوار ہوئے تھے۔

معمر آدمی سگریٹ کے لمبے لمبے کش فضا میں مرغولے بنا کر چھوڑ رہا تھا۔ جبکہ نوجوان نفرت آمیز نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ مائل ہو چکی تھیں۔ اب اُسے اس بات کا اندازہ ہونے لگا کہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہے۔

اس نے پلٹنے کی کوشش کی کہ اچانک پیچھے سے کسی کے نوک دار چیز ٹھونکنے سے کمر میں ہلکا سا درد محسوس ہوا۔ ایک آواز کانوں میں سنسناہٹ پیدا کرتی چلی گئی۔

"خاموش رہ سالے۔ چپ چاپ رہنے میں جان کی سلامتی ہے ورنہ بے موت مارے جاؤ گئے۔"

گلی میں داخل ہوتے وقت دہشت سے اُس کا رواں رواں کانپ سا اٹھا۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا۔ تو اس طرح بندوق غلط ہاتھوں میں آنے سے ایک انسان بے بس ہو جاتا ہے۔

جو رقم بنک سے نکالی ہے۔ فوراً حوالہ کردو،" مونچھوں والا اس جوان کا تیسرا ساتھی تھا۔

"خدا کے لئے مجھے چھوڑ دو۔ رحم کرو۔ یہ رقم میری اپنی نہیں ہے"۔ وہ مزاحمت کرنے لگا۔

"سالے۔ ایک بار جو کہہ دیا۔ وہی کرلو۔ فوراً نکال دو ساری رقم۔ تم نے ہمارا کافی وقت ضائع کیا ہے ورنہ ابھی"...... ایک بار پھر شدت سے کسی نوکیلی چیز چھبو کے اسکے جسم سے پسینہ کی دھاریں بہنے لگیں۔

"نکال دیتا ہوں۔" ہلکی سی کراہ اسکی دھیمی آواز میں سنائی دی۔ شاید اسے اپنی بے ننگ ونام لاش سرراہ پڑی محسوس ہوئی۔

تمام جیبوں سے سو سو روپیوں کے دونوں بنڈل کے ساتھ اور دوسرے نوٹ اور ریز گاری نکال کر فرماں بردار اولاد کی طرح اس کے ہاتھ میں تھما دیئے۔ یا امانت رکھی کوئی چیز

کی طرح واپس لوٹانے لگا۔

تھوڑے سے فاصلے پر ایک گشتی پولیس پارٹی لوگوں کو منی بسوں اور میٹاڈاروں سے باہر نکال کر آڈنٹی کارڈ چیک کرنے میں مشغول تھی۔ جامہ تلاشی بھی ہو رہی تھی۔

عمر کا لحاظ یا کوئی حد مقرر نہ تھی۔ جوان اور داڑھی والے، سبھوں سے پوچھ تاچھ ہو رہی تھی۔

اس کی گویائی سلب ہو چکی تھی۔ ایک ایک کر کے تمام جیبیں وہ خالی کر چکا تھا۔

آخری شئے جسے وہ چھپانا چاہتا تھا۔ عین موقع پر و ہی ہوا۔ جیسے رنگے ہاتھوں نشہ کرتا پکڑا گیا تھا۔

موبائیل کی گھنٹی نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

پہلے گھنٹی بجی پھر ایک مترنم آواز میں اذان سنائی دی۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔

اڈھیر آدمی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ جھٹ اس کی جیب سے موبائیل نکال دیا۔ ابھی تک تم نے اسے چھپا رکھا تھا۔ باقی رقم کدھر چھپائی ہے سالے۔ ایک لاکھ کی رقم کہاں ہے۔ لگتا ہے اب تمہاری موت تمہیں بلا رہی ہے۔"

خوف ناک آواز جیسے گھنے جنگل میں بجلی کی کڑک سنائی دی۔

"وہ ابھی کیش نہیں ہوئی۔"

واسکٹ کی دوسرے جیب سے چیک برآمد ہوئی۔

"واپس کیوں کر دی؟" مونچھوں والا پھر دہاڑا۔"

"پیسے اکونٹ میں نہیں تھے۔"

بوڑھے شخص نے چیک پھاڑ ڈالی۔ موبائیل سے سم کارڈ بھی نکال دیا۔

"یہ لے۔ حرام خور۔ کسی دوسرے میں ڈال دینا۔ بڑی کام کی چیز ہے۔ ہاں اس میں جو اذان ہو رہی ہے گھر جا کر بچوں کو بھی سنانا اور دو رکعت شکرانہ نماز بھی پڑھنا۔ مفت میں جان

بچ گئی ورنہ بے موت مارے جاتے۔" اس کے بعد ہونٹوں پر دبی سی مسکراہٹ پھیل گئی اور اپنے دونوں ساتھیوں سے جانے کا اشارہ کیا۔

"پکڑلے۔حرام زادے۔"

بوڑھے شخص نے اسکے ہاتھ میں سم کارڈ تھمادیا اور وہ وہاں سے نو دو گیارہ ہو گئے۔

ایک خاموشی چھا گئی......ایک مکمل سکوت......!

نہ کوئی ہنگامہ ہوا۔نہ کوئی شور شرابا۔نہ کوئی گولی چلی اور نہ کوئی خون کا قطرہ گرا۔

دکاندار اپنے اپنے گاہکوں سے لین دین کی باتوں میں مصروف تھے۔منی بس اسکوٹر آٹو رکھشا برابر چل رہے تھے۔زندگی رواں دواں تھی۔

جان بچی لاکھوں پائے......" ذہن کے کسی گوشے میں خوشی کی رمق اُبھر کر فوراً بجھ گئی۔

ہانپتا ہوا گشتی پولیس پارٹی کے قریب آکر ایک ادھ مرے پولیس حوالدار سے مخاطب ہوا۔

"جناب۔جناب......" اس سے زیادہ وہ کچھ اور زیادہ کہہ نہ سکا۔مارے خوف کے وہ جیسے لقوے کا شکار ہوا تھا۔

اس نے ہاتھ میں سم کارڈ دیکھا تو تڑاخ سے اس کے چہرے پر زوردار تھپڑ ماردی اور شرارت بھرے لہجہ میں غرانے لگا۔

"سالے! آئی کارڈ دکھاؤ۔یہ سم کارڈ ہے۔وہ ہکا بکا ہو گیا......!!!

..................☆☆☆..................

اپنا گھر

تالاب کے کنارے گم صم سی وہ نہ جانے کن خیالوں میں الجھی ہوئی تھی ۔ ذہن میں خیالات جیسے قلانچیں بھر رہے تھے۔ خالی خالی نظروں سے وہ اس شخص کو دیکھ رہی تھی جو کوہ کے دامن میں ایک الگ تھلگ ویران گوشے میں کسی کام میں مشغول تھا۔

سامنے صاف وشفاف تالاب کے پانی میں بنگلہ کا عکس صاف دکھائی پڑتا۔ ہوا کا معمولی جھونکا گزرتا تو اسکی ہیت ریزہ ریزہ ہوکر آڑھی ترچھی لیکروں میں دور دور تک بکھر جاتی اس طرح پانی کی سطح پر ایک ارتعاش اور ٹھہراؤ کا عمل جاری تھا۔

ایسا منظر دیکھنے کو وہ پانی میں چھوٹے چھوٹے کنکر پھینک کر اپنا دل بہلائے رہتی اسطرح فرصت کے لمحات گزر جاتے شاید اسکی سوچ مجروح تھی۔ یا عادات سے مجبور......!

ایک عرصے سے گھر کے کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ یہ سوچ کر وہ کانپ سی اٹھتی۔ ذہن میں پر اسرار ان گنت وسوسے اور خدشے اٹھتے رہتے۔ اسکی آنکھیں پر نم ہو جاتیں۔

دیکھنے میں بھولی بھالی تھی وہ...... چہرے کی جھریوں سے صاف واضح ہو رہا تھا کہ زندگی کے سرد و گرم دیکھ چکی ہے۔ بہت کچھ سیکھ چکی ہے۔ بہت سی باتوں سے واقفیت اسے حاصل تھی۔ اتنا کہ ہوا کا رخ دیکھ کر معاملہ کو سمجھ لیتی اور گتھی کو سلجھا لیتی۔

اچانک ہوا کا جھونکا آیا تو پانی میں بنگلہ کا عکس ڈوبتا اُبھرتا اور بکھرتا اپنی شناخت کھو بیٹھا۔

ایک پرچھائی سی پھیلتی ہوئی دکھائی دیتی تو وہ خوف اور ڈر سے جھینپ سی جاتی کب تک گوارہ کرتی۔ اُف تک نہ کی اُس نے......

ڈھلتی عمر میں کئے کرائے پر پانی کا ایک ریلا آیا کہ خس وخاشاک اپنے ساتھ بہالے

گیا۔ وہ ان لہروں میں کچھ تلاش کرتی رہی۔ ڈھونڈتی رہی۔

وہ جانتی تھی۔ کہ اُسے زندگی میں کتنے مرحلہ وار آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔

لڑکپن۔ اپنی سہیلوں سے مل جل کر مٹی اور ریت کے گھروندے بنانے میں مشغول رہتی اپنا دل بہلاتی۔ تسکین پاتی۔ ایک دبی خواہش پوری ہوتی۔

کبھی معمولی سی خراش اُسے آجاتی تو وہ لڑھک جاتا بکھر جاتا اور پانی کی چند بوندوں کے چھڑکاؤ سے ڈھ جاتا۔

وہ تڑپتی مچلتی روتی بسورتی نئے سرے سے غور کر لیتی تب نیا گھروندا بنانے لگتی اُسے یاد آنے لگا۔

شاید اس کا جنم سرکاری اسپتال کے بیڈ پر ہوا ہے۔ ایک بوسیدہ ویرانی جھونپڑی میں وہ پروان چڑھی تھی۔ پانچ چھ سال کمرے کی چار دیواری میں دم گھٹتا محسوس کرتی رہی ہوگی۔ دن بھر محلّہ کی دوسری لڑکیوں سے میل جول بڑھا کر کھیلتی کودتی رہتی ان کے گھر کے صحن۔ گلی کوچوں کھلے گندے میدان میں لپا چھپی کھیل میں گزر جاتا۔ لپا چھپی میں اتنا مزا کہاں۔ جتنا چھوٹے چھوٹے مٹی اور ریت کے گھروندے بنانے میں تھا۔

جب یہ دب جاتے تو ایک دوسرے سے لڑنا جھگڑنا معمول سا تھا۔ ایک دوسرے کے بالوں کو کھینچ کر پکڑنا اور چھوٹی چھوٹی بد دعا دیکر غصہ رفو چکر ہو جاتا۔ ایسا نہ ہوتا تو منہ بسورتی دیر تک روتی روتی ماں کے پاس شکایت لے کر آتی۔ ڈانٹ پھٹکار الگ آئندہ ایسی بڑی لڑکیوں سے دور رہنے کی تلقین کی جاتی۔

رات کو تھکی تھکی سی بستر پر بے سدھ پڑ جاتی۔ ماں کی شفقت بھرے ہاتھوں سے تھپکی سکون اور راحت پا لیتی۔

معصوم دل میں ایک ننھی سی خواہش اُبھر کر دیر تک وہ کافی سیاہ چھت کو گھورتی رہتی۔ یہاں تک کہ نیند کی دیوی اُسے آغوش میں لے لیتی۔ چھوٹے سے دل پر پتھر رکھ وہ معصومیت

سے ممی پاپا سے نیا گھر بنوانے کو پوچھتی۔ کریدتی رہتی اثبات میں جواب پا کر پریوں کے دیس میں اپنے نئے گھر کے صحن میں کھیلتی کودتی اچھلتی محسوس کر لیتی۔

وہ اکثر کہا کرتی۔ میرا ایک گھر ہو۔ ایک بڑا خوبصورت گھر۔ ایک بڑا کشادہ کھلا صحن ہو۔ رضیہ سلمہ، شازیہ، جیسا نہیں! نہیں۔ نازیہ جیسا...... دن بھر وہاں کھیلتی رہتی۔ منا بھیا بھی دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیلتا۔ اب چھپا چھپی نہیں...... گھروندا بنانا بکواس ہے۔ ہاتھ میلے ہوتے ہیں۔ کپڑے گندے ہوتے ہیں۔ پھر ممی کی پھٹکار۔ پاپا سے کہوں گی کوئی گڑیا اور گڑی کا کھلونا لائیں۔ ہا...... ہا...... کتنا مزا آتا ہے کھیل کھیل میں...... میں گڑیا کے نئے کپڑے سلواؤں گی۔ نیا موتیوں کا ہار۔

عرش والے نے فرش پر لیٹی لیٹی بے سدھ پڑھی بجھی بجھی سی آنکھوں میں نمی دیکھی تو شان کریمی جوش میں آئی۔ ایک دن باتوں باتوں میں نیا گھر بنوانے کی بات کانوں میں پڑی تو وہ پھولے نہ سمائی۔ جیسے ساری دنیا کی خوشیاں اسکے دامن میں سمیٹ کر ڈال دی گئی ہوں۔ کتنی بے قرار اور مضطرب لگ رہی تھی۔

چار کمروں پر مشتمل ایک نئے مکان پر کام شروع ہوا۔ بیماری کا بہانہ کیا تو اسکول سے ایک مہینہ تک تعطل رہا۔ جذبات سے مغلوب ہو کر کمزور شانوں پر دو دو چار چار انیٹیں اٹھاتی رہی۔ ننھے ننھے چھوٹے چھوٹے ننگے پیر ہرنی جیسی چال دوڑتی پھرتی چھوٹے چھوٹے کاموں میں جٹی رہتی۔ کبھی اِدھر کبھی اُدھر۔ اب کہیں کسی کے صحن۔ گلی، کوچہ میدان میں کھیلنے کا کوئی دھیان نہ رہا۔ اور نہ اپنی سہلیوں کو دیکھ کر کسی تشویش کا اظہار کیا۔

دکھ اُسے اس بات کا کہ بڑی عمر کی ہوتی تو شاید توانا جسم ہوتا۔ رات رات ممی کو چرخہ کاتنے میں ہاتھ بٹا دیتی۔ جتنا ہو سکا۔ اس کام میں اس نے نفی کا کلمہ زبان پر آنے نہ دیا۔

نیا مکان بنا۔ در دیوار پر جوں جوں رنگ و روغن کی تہہ بہ تہہ پرت چڑھ گئی توں توں اسکی جوانی کی دہلیز تک مسافت کم معلوم ہوتی پڑی۔

گھر کی حالت کافی سدھر چکی تو خوبصورت مکان میں تمام آرائیش بھی آ گئیں دونوں بھائی بہن مقامی کالج میں داخلہ لینے میں بھی کامیاب ہوئے۔

وقت گزرتا رہا۔ کئی برس چٹکی میں بیت گئے۔

غزالہ کی شادی کی رسم شہر کے ایک متوسط گھرانہ میں طے پائی۔ اسلم ایک دور دراز گاؤں میں بحیثیت جوانیئر انجینئر تعینات ہوا تھا۔

بچپن گیا۔ کوئی افسوس نہ ہوا۔ ماں باپ کی شفقت سے محرومی الگ۔ جس چیز نے اُسے بے جان اور افسردہ بنا دیا۔ وہ ان دونوں کا ملاپ گھر سے جدائی پر ہو رہا تھا۔ پرانی ریت رہی ہے کہ آخر لڑکی کا گھر اسکے سسرال کی چاردیواری سے لحد تک مسافت طے کرتی ہے۔

بھول کر وہ بچپن کی یاد بھلا نہ سکی۔ بے بس ہو کر ذہن کے ایک گوشہ میں اُسے پوٹلی میں باندھ کر محفوظ کر دیا۔

جوائنٹ (مشترکہ) گھر تھا۔ ان دونوں میاں بیوی کے مزید دو اور دیوران کی بہو رانیاں۔ ایک دوسرے سے سبقت لینے کی فکر میں لگی رہتیں۔

غزالہ دو بچوں کی ماں بنی۔ دیکھ بھال کی ذمہ داری بڑھتی گئی۔ بچوں کی پڑھائی اور دوسرے گھریلو اخراجات میں اضافہ ہوتا رہا۔

زیادہ دیر تک بھرم قائم نہ رہا۔

ایک دن جوائنٹ گھر اختلاف کے دہلیز پر آ کر ریزہ ریزہ ہو کر بکھرا تو گھر کی ساری جائیداد کا بٹوارہ ہوا۔ جائیداد میں تھوڑی بہت رقم کر لے کر اُسے کرایہ کے مکان میں دو کمروں میں منتقل ہونا پڑا۔ مکان سے بے دخل کیا ہوئی گویا کھلے آسمان کے تلے بچوں سمیت فٹ پاتھ پر آ گئی۔

بار بار بچی کی معصوم آنکھوں میں اپنا جیسا تردد اور پچھتاوا دیکھ کر بے آب مچھلی جیسی تڑپتی۔ گھبرا جاتی چہرے پر افسردگی اور پژمردگی برداشت نہ ہوتی۔

تمام زیورات بک گئے۔ سگے اور جان پہچان سے قرض لینے کی نوبت پڑی۔ پھر بھی سب صعوبتوں کا سامنا خوشی خوشی کیا۔

ایک غم دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا کہ کب نیا مکان پلک جھپکتے ہی کھڑا ہو۔

نئی سوچ نئی طرز پر تعمیر کا کام ہوتا رہا۔ دن رات شد و مد سے وہی ہرنی جیسی پھرتی دکھائی پڑی۔ مکمل ہوتے ہی اب آہستہ آہستہ آرائشی چیزیں اپنی اپنی جگہ پر منتخب ہوئیں۔ اُسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اس نئے بنگلہ کی مالکن ہے۔ ایک خوشحال کنبہ کی علامت تصور کی جانے لگی۔ الگ تھلگ پہاڑون کے دامن میں رنگ و روغن سے سجا ماڈرن طرز پر ایک خوبصورت پیلس سے کم دکھائی نہ دیتا۔

قدرت اتنی مہربان ہوئی کہ تھوڑے فاصلے پر ایک پُر شفاف تالاب اسکی رونق اور جاذبیت کو نکھارنے میں چار چاند لگاتا رہا۔ آبی پرندے کوسوں دور سے آکر تالاب کے گرد بیٹھتے ہوئے مدبھری آوازوں میں جنت کی حوروں کا گمان ہوتا۔

کھڑکی کا پٹ کھل جاتا تو سامنے پہاڑی کے ڈھلوان پر دور دور تک رنگ برنگ پھولوں کا مخمل بچھا منظر آتا۔ تالاب سے بنگلہ تک چھوٹی سی پگڈنڈی کسی دلہن کی مانگ کی سندور سے جاملتی۔ کتنی خوش تھی غزالہ......!

ایک ایک پیسہ بچا کر نئے گھر میں نئی نئی چیزیں آنے لگیں۔ فرش و پردے۔ ڈرائنگ سامان۔ بیڈرسوئی سامان سے لے کر میک اپ تک......کوئی نئی چیز بازار میں دستیاب ہوتی تو سستے اور مہنگے داموں پر خریدتی جاتی۔ گھر کو بنانے اور سجانے میں ذرہ ذرہ پر اسکی محنت اور سوچ ثبت کردہ تھی۔

اس طرح ایک دن ان نئی چیزوں کے ساتھ ایک گول مٹول خوبصورت لڑکی رقیہ نے بہو بنکر گھر کی رونق اور بڑھادی۔ اب پرانی چیزوں کو اپنی جگہ سے ہٹا کر جہیز کی چیزوں نے گھیر لی۔ پرانی چیزوں پر گرد اور میل جمتا رہا۔ رفتہ رفتہ ان کی جاذبیت ہدف نشانہ بن گئی۔

خیالات کس قدر بدل گئے۔ پرانی چیزوں کو اوٹ آف آڈر قرار دیکر برآمدے تک گھسیٹ کر لایا گیا۔ فالتو سمجھ کر بے کار چھوڑ دیا گیا۔

یہ تو زبیدہ بیٹی کی خوشی قسمتی تھی۔ قبل اسکے اسکی شادی ہو چکی تھی۔ کیا پتہ کہیں وہ پرانی چیزوں کی فہرست میں دوسرے نمبر پر آ جاتی۔

کہتے ہیں۔ بزرگ لوگوں کو پرانی چیزوں سے کافی انس اور لگاؤ ہوتا ہے۔ پہلی دلیل میں ماضی ان سے منسلک ہوتا ہے دوسری دلیل میں شاید ان کی قلیل آمدنی کا زیادہ دخل ہے اپنی خریدی چیزوں کی بے قدری اور ضائع ہونا برداشت نہ ہو سکا تو وہ سلیقے سے ترکیب دینے میں جٹ گئی۔ یک لخت کئی چیزوں کے گرنے کی آواز سنائی دی۔

پلٹ کر دیکھا تو چند مشکوک آدمیوں کو دیوار پھلانگ کر برآمدے میں پایا۔ خوف اور ڈر سے اندر کی سانس اندر اور باہر کی سانس باہر رہ گئی۔ سر سے پاؤں تک برقی قوت کی لہر چھو گئی۔ آنکھوں کے سامنے ایک گھپ اندھیرا سا چھانے لگا۔

''گھر میں کتنے بندے ہیں؟'' آتے ہی مخاطب آدمی کی آواز دھاڑے شیر جیسی سنائی دی۔

''کو......کوئی نہیں۔'' وہ چونک پڑی اور بڑبڑاتی ہوئی بولی۔

''جھوٹ بولتی ہے کمروں کی تلاشی لو۔ سچ بولی تو ٹھیک ورنہ خلاصی ......'' وہ پھر سے غرایا۔

وہ خوف زدہ تھی۔ مجرم کی طرح کسی کٹہرے میں کھڑا محسوس کیا۔

ایک موٹے جسامت بھرے آدمی کے بارعب چہرے پر تفکر کے آثار صاف جھلک رہے تھے۔ گھنی داڑھی اور لمبی لمبی مونچھیں تربوزہ جیسے گول گول چہرہ پر دو چمکتی ہوئی آنکھیں بغور ہر شے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ شانوں پر شال کو بار بار جھٹکنے سے اس کی کمر پر بندھے بیلٹ سے پستول صاف لٹکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کے تینوں ساتھی کشمیری پھرن میں کسی نوک

دار لمبی شے کو کندھے پر لٹکتے ہوئے پیچھے کی طرف دھکیل دیتے تھے۔

دو آدمی کلین شیو تھے اور تیسرے آدمی کو بے ترتیب مٹھی بھر داڑھی اسکی صورت کو مزید ڈراونی بنا رہی تھی۔ وہ تیزی سے مکان کے اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد باہر آیا تو مونچھوں والے کے پاس جا کر کوئی خفیہ سی بات کرنے لگا۔

"مائی۔ تم نے بتایا نہیں۔ کتنے آدمی ہیں۔"

"میرے سوا بہو بھی ہے جو میکے گئی۔ شاید شام تک لوٹ آئے گی اور میرا بیٹا نوکری کے سلسلہ میں باہر ہے۔" وہ لرزتی کانپتی ہوئی بولی۔ خوف سے سارا جسم ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ جیسے عزرائیل کے کسی ایجنٹ سے سامنا پڑا ہو۔

"اور کوئی ہے۔ صاف صاف اور سچ بتاؤ ورنہ......

ہاں......ہاں......ایک نوکرا کرم بھی ہے۔ سودا لانے بازار چلا گیا۔ آ رہا ہوگا۔"

"کھانے کا فوراً انتظام کردو۔ فی الحال اچھی چائے بنا کے دو۔ کافی تھک گئے ہیں۔"

"لیکن روٹی......نہیں ہے۔" وہ رک رک کر پورا جملہ مشکل سے بولی۔ جیسے زبان پر لقوہ گرنے کا احتمال رہا۔

"کوئی بات نہیں۔ روکھی سوکھی ہو تو کام چلے گا۔" مونچھوں والا آدمی قدرے نرمی سے بولا۔

"جان بچی لاکھوں پائے۔ دوڑتی گرتی بھاگتی وہ کچن کو پناہ گاہ سمجھنے لگی۔

گرم گرم پانی گیس چولہے پر ابل رہا تھا۔ دفعتاً باہر دروازہ پر کھٹکھٹانے کا شور بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ شاید کوئی عجلت میں دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔

وہ چونک پڑی، کیتل کو چھوڑ کر گبھرائی ہوئی باہر آئی کہ پاؤں تلے کی زمین جیسے کھسک گئی۔ فوراً سنبھل نہ پاتی تو شاید منہ کے بل گر پڑتی۔

"اندر کتنے آدمی ہیں۔۔ کہاں ہے وہ......" زناٹے دار تھپڑ کی آواز دیر تک گونجتی رہی۔

''کوئی نہیں۔ کون لوگ......'' بے تکی بات میں ابھی تھوڑا سا دم باقی تھا۔

''جھوٹ بولتی ہے سالی۔ دہشت گرد اور کون۔ جاؤ اندر تلاشی لے لو۔''

وردی پوش جوانوں کی ایک جماعت بندوق تان کر سارے صحن میں پھیل چکی تھی۔ ہر ایک کی نظریں چپے چپے کو چھان رہی تھیں۔ مضطرب آنکھوں میں غصہ اور شرارت کی چنگاریاں بھڑک رہی تھیں۔ گویا ساری چیزوں کو بھسم کر دینا چاہتی ہوں۔

زینہ پر کھڑا ہاتھ میں پستول لئے ایک نوجوان سردار شاید آفیسر لگ رہا تھا۔ اپنے دیگر ساتھیوں کو اشارہ کرتے ہوئے پوزشن سنبھالنے کی ہدایت دیتا ہوا کرخت ناک آواز میں بولا۔

''اندر جاؤ۔ چپہ چپہ کی تلاشی لینا۔''

حکم پاتے ہی دو سپاہی دندناتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ لگ بھگ پندرہ بیس منٹ کے بعد سارے گھر کا کونا کونا چھان مارا۔ اور ناکام و مایوس ہو کر لوٹ آئے۔ اس اثناء میں غزلہ برآمدے کے ایک کونے میں کھڑی اللہ میاں کو یاد کرتی رہی۔ کئی بار قل پڑھا اور درود پڑھا۔ بچنے کی لالچ میں نذر و نیاز کی نیت بھی باندھی۔

''کوئی نہیں جناب......'' ایک سپاہی بولا۔

''کہاں چھپا دیا ہے سالی۔ سامان کدھر رکھا۔ سچ سچ بتاؤ ورنہ جان کی خیر نہیں۔'' نوجوان سردار خشم ناک ہو کر بولا۔

''کوئی نہیں۔ کوئی نہیں آیا۔ کوئی سامان نہیں۔'' اچانک اس پر ہذیانی سی کیفیت طاری ہوئی۔

''اگر جھوٹ نکلا تو سارے مکان کو آگ لگا دیں گے۔ سمجھی بوڑھیا۔ ان کے آنے کی خبر دینا''......

زینہ سے اترتے وقت وہ اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے چباتا رہا۔ پستول جیب میں ڈالا ہاتھ کو اوپر اٹھا کر دوسرے ساتھیوں کو نکلنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"سالے نے غلط انفارمیشن دی ہے۔"

صدر دروازے سے نکل کر اس نے ایک گہری سانس لی۔ جیسے سر پر لٹکتی تلوار سے رہائی پائی۔ تھکی ماندی جیسی کچن میں لپکی۔ فریج سے سرد پانی کی بوتل نکال کر غٹا غٹ تین چار گلاس حلق سے اتار دیئے۔ تھوڑی سی راحت پائی اور فرش پر دراز کافی دیر تک بے سدھ پڑی رہی۔

دونوں پارٹیاں آندھی جیسی آئیں اور گئیں۔ کوئی توڑ پھوڑ نہ ہوئی۔ صرف کمرہ...... فرش پر بے ترتیب بستر کپڑے اور چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ چند الماریوں کے پٹ کھلے ملے۔ تمام کمروں کے دروازے کھلے کھلے تھے۔ اللہ کا شکر ادا کیا اور دو رکعت شکرانہ کے طور پر ادا کر کے چیزوں کو اپنی جگہ پر سنبھالنے میں لگ گئی۔

اُن کا آنا تھا گھر کا ماحول بدلا بدلا سا محسوس کیا جیسے تیل پر جلتی نے کام کر دیا۔

اس گھر میں رقیہ ہی وہی ذات تھی جو اندر ہی اندر پھولے نہ سماتی۔ اسے ایک خوبصورت آلہ ملا۔ اس واقعہ کو وہ اپنے پیرائے میں توڑ مروڑ پیش کرتی کر سننے والا تعجب و استعجاب کا شکار ہوتا۔ اور غزالہ اسکی موجب بنتی۔

غزالہ مثالی عورت جیسی باتون کو ان سنی کر دیتی اور ہمیشہ اس نے ماں کا تقدس برقرار رکھا۔

پانی سر سے اوپر تک آ گیا تھا۔ اس بات کی بھنک اسوقت لگی۔ جب اُس نے رقیہ کو بیٹے سے الٹی پلٹی سناتے پایا۔ بہو بیٹے کی تکرار سے معلوم پڑا۔ کہ اب وہ گھر میں ایک فرسودہ بے کار چیز سمجھی جاتی ہے۔ بے کار فالتو چیزوں میں اس کا شمار اول نمبر پر آتا۔ لیکن ضبط اور اپنی دانائی اور تجربہ کی بناء پر ہر بار بچ نکلتی۔

تا این دم رقیہ کی بات ذہن میں گونجتی رہی۔

اس بڑھیا نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ ہر معاملے میں اپنی ٹانگ اڑاتی ہے۔ مکان

میں گھٹیا اور سستا مال پر فخر کرتی رہتی ہے گھر میں کیا تھا۔ میرے باپ نے ڈھیر ساری چیزوں سے اتنی بارش کر دی کہ اب رکھنے کی جگہ نہیں۔"

واقعی رکھنے کے لئے جگہ نہیں تھی۔ بوڑھی غزالہ کے پاؤ بھر جسم کے لئے اب جگہ کی گنجائش کافی تنگ پڑی۔

تالاب کے کنارے پر آ کر چند کنکر پانی میں پھینک دینا یوں فرصت کے لمحات گزر جاتے تو تشفی پاتی۔

لیکن آج تالاب کے کنارے پر بھی کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ نہ کوئی عکس، نہ ہوا کا جھونکا نہ کوئی ارتعاش!

بند مٹھی سے بھاگا پرندہ

کئی دنوں تک شہر میں ناکہ بندی سے وہ اس قدر خوف زدہ ہو چکا کہ سر پر چادر تان لیتا تو پاؤں ننگے پڑ جاتے اور چادر پاؤں کی جانب کھسکاتا تو سر ننگا ہو جاتا۔ ایسا ہوتے ہوئے اس نے کبھی یہ نہ سوچا تھا کہ پولیس کنٹرول روم کے احاطہ کے باہر موجود چند سپاہی پہرہ دے رہے ہیں۔ دفعتاً گیٹ کے اندر ہارن بجنے کی آواز سنائی دی۔ فوراً ان میں سے ایک نے گیٹ کھولا ایک سفید رنگ کی جیپسی بڑی پھرتی سے باہر نکل آئی اور اگلے ہی لمحے وہ ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ سپاہی نے گیٹ بند کیا اور پھر اپنی جگہ پر آکر کھڑا ہو گیا۔ جیپسی کی چھت پر آگے پیچھے دو میکروفون لگے ہوئے تھے۔ ایک کا منہ آگے کی طرف جبکہ دوسرے کا مخالف رخ میں تھا۔ جیپسی کے اندر ڈرائیور کے سمیت یہی کوئی چار یا پانچ گن مین کافی مستعد اور چاق چوبند نظر آرہے تھے۔ ایک کڑیل لمبی لمبی مونچھوں والا حولدار ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر بیٹھا ہوا ہاتھ میں مائیک سنبھالے لوگوں کو مطلع کرنے لگا۔

''سارے شہر میں کرفیو لگنے میں ایک گھنٹہ باقی ہے۔''

یہ سنتے ہی لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ چہروں کے رنگ فق پڑ گئے اور ہونقوں کی طرح ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے قیامت بن کر یہ بات ان پر ٹوٹ پڑی تھی۔

شمس الدین کی حالت ان سے کم دکھائی نہیں پڑتی تھی۔ خوف و دہشت نے اسکے بھی حواس گم کر دیئے۔ وہ مایوس کن نظروں سے آسمان کی وسعتوں میں تکتا جا رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرتا ہوا چند لمحوں کے لئے تو وہ جیسے سن سا گیا۔ پھر دیر تک کانپتے ہونٹوں سے بڑ بڑایا۔

''یا خدا! یہ کیسا تیرا غضب۔ ابھی ابھی گھر سے نکلا اور خالی ہاتھ لوٹ رہا ہوں اب کیا ہوگا'' اسے سارا معاملہ گھمبیر دکھائی دیا۔

دور سے کہیں ابھی تک رک رک کے دھماکوں اور گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

سامنے پژمردہ چہرے لئے لوگوں کا قافلہ درقافلہ آندھی کی طرح گزرتا جارہا تھا۔

وہ بس اڈہ کے صدر دروازے کے قریب ایک بیرونی کشادہ جگہ پر مبہوت سا کھڑا تھا۔ یہاں اکثر اوقات وہ ریڑی پر پرانے کپڑے بیچ بیچ کر اپنا گذارہ کر لیتا۔ اور حالات کا اچھی طرح جائزہ لے سکتا تھا اور ہر آنے جانے والے مسافر کو بخوبی دیکھ سکتا تھا۔

''بھئی! گولی کہاں چلی۔ لوگ باگ کیوں اس قدر خوفزدہ اور افراتفری میں دوڑتے جارہے ہیں۔'' اس نے تیزی سے ایک راہ گیر کو روکتے ہوئے پوچھا۔

''سنا ہے۔ مائسمہ بازار میں ایک بڑا دھماکہ ہوا ہے۔ لالچوک کے کسی بڑے ہوٹل میں بھی حفاظتی دستوں اور چھپے عسکریت پسندوں کے درمیان گولیوں کا تبادلہ ہو رہا ہے۔ ایک جپسی اڑائی گئی دو سپاہیوں سمیت تین شہریوں کی ہلاکت کی خبر ہے۔''

''ادھر حریت تنظیم کے کسی بڑے لیڈر کی گرفتاری پر کئی بچے اور جوان پتھراؤ پر اتر آئے تھے۔ سرکاری گاڑیوں کے شیشے توڑے گئے ایک ایمبولنس بھی جلادی گئی۔ غصہ میں آکر سپاہیوں نے گھنٹہ گھر کے قریب دو درجن سے زائد لوگوں کی پٹائی کر کے ہڈیاں اور پسلیاں توڑ توڑ کے رکھدیں۔ میری مانو۔ جلدی سے کپڑے سمیٹ لو اور یہاں سے فوراً کھسک جاؤ۔ حالات کافی سنگین ہیں۔''

اس اجنبی شخص نے دم بھر سانس لیتے ہوئے کھڑے کھڑے رام کہانی سنائی۔ مزید کچھ اور اس سے پوچھ لیتا کہ بھیڑ کے ریلے میں وہ لاپتہ ہو گیا۔

وہ خوف سے کانپ اٹھا۔ سارے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ ہونٹ سکوڑ کر چپکے

چبکے ایک ادھ موٹی گندی گالی دے گیا۔ تھوڑی باقی بچی کچی منہ کے اندر اٹھے جاگ میں گھل مل کر حلق سے نیچے اتر گئی۔ اُسے ایسا لگا کہ پیٹ میں گویا خود اپنے ہاتھوں سے خنجر گھونپ دیا ہو۔ یا پیٹ سے اٹھی بھوک کی کڑواہٹ پر تھوک دیا ہو۔

شمس الدین بغیر وقت ضائع کئے ریڈی پر بے ترتیب بکھرے کپڑوں کو سمیٹنے لگا۔ اس طرح اُنہیں ایک بڑی گٹھری کی شکل میں بدل دیا۔ اُسے گھر جانا تھا۔

ریڑی کے پیچھے کھڑے ہو کر رب کا نام لیتے ہوئے اُسے آگے کی طرف پہلا دھکا دیا۔ دوبارہ آسمان کی طرف نظر ڈالی۔

''میرے مولا۔ تیرا فضل کافی ہے تو اپنا رحم فرما۔''

پھر اپنے قریبی ساتھی کو ایک ٹک دیکھا اور خلوص بھرے لہجہ میں مخاطب ہوا۔

''دلاور! جلدی کر۔ تم کو میرے سے بہت دور جانا ہے۔ سب لوگ جا چکے۔ میں بھی جا رہا ہوں۔''

ابھی تک دلاور کسی گہری سوچ میں الجھا ہوا تھا جیسے سانپوں اور بچھوؤں کے گھیراؤ میں آ کر نکلنا چاہتا ہو۔

''اب کس سوچ میں پڑے ہو۔ یہاں زیادہ دیر تک ٹھہرنا جان کر خطرہ مول لینا ہے۔ شمس الدین نے اُسے ٹوکتے ہوئے کہا اور چند لمحوں تک اس کا انتظار کرتا رہا۔

''بھئی کیا بتاؤں۔ خلجی کو کیا منہ دکھاؤں۔ اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی مجھ سے۔ رات بھر درد سے کراہ رہی تھی۔ اسکی دوائی کی بوتل پچاس روپے کو ملتی ہے۔ آج کی کمائی صرف بیس روپیہ سے زیادہ نہیں ہوئی۔ سالی یہ دوائی بھی کتنی مہنگی ہو گئی اور شفا سے بالکل خالی خالی!

کھڑے کھڑے دلاور میر نے اپنی بات سناتے ہوئے گویا اپنے دل کے کسی بڑے بوجھ سے تھوڑی دیر کیلئے نجات پائی ہو۔ پر مصیبت ٹل نہیں گئی اپنی جگہ پر قائم تھی۔

صبح سویرے اس نے ریڑی کو دل موہ لینے والی چیزوں اور بچوں کے کھلونوں سے سجا رکھی تھی۔ دیہاتیوں کے علاوہ بہت سی شہر کی عورتیں لپ اسٹک و پاوڈر اُسے خرید کرتیں جو بازار کے اونچی دکانوں کی بہ نسبت سستی اور مناسب داموں پر دستیاب ہوتی تھیں۔

متواتر کئی سالوں سے بندوق اور گولی نے سیلانیوں پر روک لگادی اور سارے دھندے مندے کاریگر کارخانوں سے باہر نکل کر سڑک پر آ گئے یہ ایک جیسے مفلوک الحال اور وقت کے ستائے ہوئے کاریگر تھے کسی زمانے میں ایک قالین بافی کا کام کرتا جبکہ دوسرا شالوں پر کڑھائی......

"یا اللہ! اپنی مدد کر۔" بیک وقت دونوں کے ہونٹوں سے آواز نکل آئی۔ اچانک ایک غیبی توانائی انکے جسموں میں سرایت کر گئی اور اپنی اپنی ریڑی کو آگے بڑھانے کی کوشش میں لگے رہے۔ اتنے میں دور پیچھے رہ گئے دوسرے ریڈی والے شامل ہو کر ایک چھوٹا سا کارواں بنتا گیا۔ ایک دوسرے کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگے گویا وہ اپنی اپنی خواہشات کے تابوت لئے دوڑے جا رہے ہوں۔

لوگوں کا رش اب بالکل کم دکھائی پڑتا تھا۔ پھر بھی جو رہ گئے تھے۔ کسی محفوظ جگہ پر پہنچ جانے کے لئے خوف میں ڈوبے ہوئے بے تحاشہ بھاگے جا رہے تھے۔ دھکا سے دھکا۔ گالی سے گالی دیتا ہوا ہر کوئی جیسے جلدی میں تھا۔

دیکھتے دیکھتے ساری سڑکیں آس پاس کے گلی کوچے سنسان پڑے۔ آٹو رکشا، کاریں، لاریاں اور اسکوٹر سبھی گاڑیاں زمین میں جیسے سمائیں یا آسمان میں اڑ گئیں کہ دور دور تک دکھائی نہیں پڑ رہی تھیں۔ دکانوں کے شٹروں پر موٹے موٹے آہنی تالے چڑھے۔ کتنی صبر آزما گھڑی کہ سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ چیخ پڑے تو...... گولی کا نشانہ بننے میں ذرا دیر نہیں۔ اب صرف ریڑوں کے پہیوں کی آواز دور دور تک سنائی پڑتی تھی۔

راستے کے دوراہوں پر پولیس کی گشتی پارٹیاں پہرے میں لگی تھیں بس ان کے بوٹوں

کی چاپ یا ڈنڈوں کی آوازیں ماحول کو سنسناہٹ اور دہشت کو وسعت دے رہی تھیں۔ ہر آنے جانے والے کے سواگت میں وہ گرم گالیوں سے نوازتے ہوئے تیز دوڑنے کا مشورہ دیتے تھے۔

سڑک کے آخری موڑ پر شمس الدین اپنے دوسرے ساتھیوں سے جدا ہو گیا اور سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔

"کرفیو کو ہٹنے دو تو دوبارہ ملتے ہیں۔"

شاید ایسا ہی جواب پا کر وہ ایک تنگ گلی میں جا گھسا۔ یہ راستہ اسکے گھر جانے کا شارٹ کٹ تھا۔ اچانک سامنے کی دوسری گلی سے ایک تیز رفتار اسکوٹر سوار گھبراتا ہوا نکل گیا۔ فوراً اس نے بائیں طرف ریڑی گھمائی نہ ہوتی۔ جسم کے کسی نہ کسی انگ پر چوٹ آجاتی۔ قسمت اچھی تھی دونوں اس حادثہ سے بال بال بچ گئے۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔ معاً اسکے ذہین میں کوئی خیال اس طرح کوندا کہ چند لمحوں تک وہ ٹھٹھک کر رہ گیا۔ اُسے یاد آیا۔ پچھلے ماہ اس نے ایک ضعیف بوڑھے آدمی کو گاڑی کی زد میں آتے دیکھا تھا۔ خون سے لت پت اسکی دونوں ٹانگیں چکنی سڑک سے پیوست ہو گئیں تھیں۔ جسم کا دھڑ دوسری طرف گرا پڑا ریت پر مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ پاس سے گزرنے والا ہر ایک آدمی تیزی میں تھا۔ اُسے بچانے سے انہیں کوئی مطلب نہ تھا۔ بس اتنا ہی ان سے ہو سکتا تھا۔ کہ رومال سے اپنی ناک ڈھانک لیتے۔ شاید انہیں اس اپنے اندر کی بدبو کا احساس ہو جاتا تھا اس نے بھی اوروں کی طرح وہاں رکنا مناسب نہ سمجھا۔ کورٹ کچہری کے چکر اور پولیس تھانے کا طواف کرنا کون پسند کرتا ہے۔

انسانیت اب بس نام کی چیز بنکر رہ گئی ہے۔ انسانوں کی اس بستی میں ایک سچے انسان کی پہچان کرنا بے حد مشکل ہے...... اس نے جھٹک کر اپنے خیال کو مار گرا دیا۔

راستے میں اسکے دماغ میں بھولی بسری یادیں ایک ایک کر کے آئیں اور چلی گئیں۔ کتنے اچھے دن اور بے خوف راتیں ہوا کرتی تھیں رات کے دوسرے پہر میں بھی لوگ سینما

گھروں سے نکل آتے تو کہیں بچے عورتیں اور مرد شادی و بیاہ کی مجلسوں سے لوٹتے وقت سواری کا انتظام نہ ہونے سے دو دو تین کلو میٹر اماوس رات میں بھی بلا خوف و خطر رستہ طے کرتے۔ بھوت پریت یا چوری چکاری کا ڈر بالکل نہیں ہوتا تھا۔ ڈر تو صرف بھاولے کتوں کے کاٹنے کا لگا رہتا تھا۔

گلی پار کرتے وقت شمس الدین کو چند چھوٹے چھوٹے بچوں کی مختصر سی بھیڑ کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ بے خوف ہو کر ہاتھوں میں بینر لئے فلک شگاف نعرے لگاتے ہوئے سامنے سے ہر گزرتی سواری پر پتھر اور انیٹیں پھینکتے ہوئے اپنے معصوم دلوں کی بھڑاس نکال دیتے اسے اپنے بچوں کی یاد ستانے لگی۔ نجانے اس وقت کس حال میں کہاں ہوں گے۔ وہ کسی بھی صورت میں گھر پہنچ جانا چاہتا تھا۔

ایک اونچے قد کا چھوٹا بچہ عمر میں دس بارہ سال کا زور زور سے نعرہ لگا رہا تھا۔

''ہم کیا چاہتے ہیں۔؟''

دوسرے بچے پر جوش لہجہ میں اس کا وہی جواب دیا کرتے جو وہ اپنے بڑوں سے سنتے چلے آئے تھے۔

یہاں سے اب شمس الدین بہت دور نکلنا چاہتا تھا۔ اس کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ کوئی فتنہ ضرور رونما ہونے والا ہے۔ وہ بہت دُور تک نکلتا چلا گیا۔ معاً اُسے خیال آیا کہ وہ موت کے شکنجے سے ابھی بچا نہیں ہے۔

حفاظتی ایجنسیاں اپنی حفاظت میں لگی سڑکوں پر گشت کرنے میں مصروف تھیں۔ جیسیاں اور بکتر بند گاڑیاں جیسے مورچہ سنبھالے کھڑی تھیں۔ ہر ایک پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے حالات کا بغور جائزہ لے رہی انکی نگاہئیں کہ کوئی شرارتی پرندہ پر نہ مار سکے۔ پچھلے چند مہینوں سے کئی سلسلہ وار دھماکے ہوئے۔ کئی جانیں تلف ہوئیں۔ لہٰذا چوکسی بڑھانا از حد ضروری تھا۔

پر کٹے پرندہ کی طرح اب شمس الدین اپنے گھر کی دہلیز پر کھڑا تھا۔ ریڑی کو آنگن میں

اور گٹھری کو کمرے کے ایک گوشے میں رکھکر چٹائی پر دراز ہو کر اس نے اطمینان بھری سانس لی۔ باہر سڑک پر سپاہیوں کے بھاری قدموں کی چاپ نے سارے ماحول پر ایک وحشت طاری کر رکھی تھی۔

غزآلہ کہاں چپ سادھے بیٹھی رہتی۔ اس نے شمس الدین کو خالی ہاتھ دیکھ کر آسمان سر پر اٹھالیا۔ سامنے فرش پر کچن کے خالی برتنوں اور خالی کنستروں کو الٹ پلٹ کے رکھدیا۔ اب تھکی تھکی ہاری ہوئی ریس گھوڑی کی طرح ہانپتی جارہی تھی ڈھیر مسائل لئے اُسے خونخوار نظروں سے دیکھتی جارہی تھی۔ اس نے مینڈک کی طرح ٹرٹر کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اب دیر سے ہچکیاں لیتی رہی۔ درد کی ایک ٹیس اسکے دل میں اٹھتی تھی۔

''کل کی مرتی۔ آج مرجاؤں۔ بچوں کو کیا بھوکے سلاوٴں'' بُرا سا منہ بنا کر وہ چیختی چلاتی رہی۔ رونے سے اس کا گلا بیٹھ گیا تھا۔ اب تو آواز بمشکل حلق سے نکل پارہی تھی۔

پاس ہی کمرے کے ایک کونے میں شمس الدین گم صم بیٹھا دور خلاؤں میں تکتا جارہا تھا۔ ضبط سے کام نہ لیتا تو بات اس حد تک بڑھ جاتی کہ دیکھتے دیکھتے سارا گھر کباڑ خانہ میں بدل جاتا۔

''غزآلہ! تجھے کئی بار سمجھایا کہ بازار کی حالت ان دنوں ٹھیک نہیں۔ جانے لوگوں کو کیا ہوا۔ کچھ خریداری نہیں ہورہی ہے۔'' ایک اچھا سا موقع پا کر شمس الدین گویا ہوا۔

''ادھار ہی لیتا۔ اتنا بھی نہ کرسکا، کیسا مرد ہے تو۔ اپنے بیوی بچوں کا خیال نہ کیا۔''

''ایسے موقعوں پر ہر کوئی اپنا ہی رونا روتا ہے۔''

''گھر میں اناج کا ایک دانہ بھی نہیں۔ کیا بچوں کو کھانے پر اپنا کلیجہ چبانے دوں۔''

گویا غزالہ ہری ہری سبز مرچیں کھا کر اناپ شناب بکی جارہی تھی۔ چہرے کا رنگ سرخ و پیلا ہوا اپنی بدستور ضد پر قائم تھی مگر دیر تک شمس الدین دل پر اس کے وار سہتا رہا۔ غزالہ کی طرح آپے سے باہر نہ ہوا۔ مانا کہ اسکی رگوں میں بارود جیسی گرمی تھی۔ سانسوں میں اتنی

حرارت تھی کہ اپنا سر در دیوار سے پھوڑتا یا اس بے حس عورت یا بے مغز بیوی کو پیٹ ڈالتا۔ خاموش رہا۔ صبر و تحمل سے کام لیا۔ اپنا غم غلط کرنے کے لئے پاؤ بھر تمبا کو چلم میں ڈال دیا۔ حقے کی نے بانسری کی طرح بجنے لگی۔ جب تھوڑی دیر بعد معاملہ ٹھنڈا پڑا۔ اُسکے شانے کو تھپتھپاتے ہوئے اپنے شیشے میں اتارنے کی کوشش کرنے لگا۔

"غزالہ۔ تم کو پہلے ہی بتایا نا۔ تم کہاں سنتی ہو۔ میں جانتا تھا۔ وقت پر کوئی اعتبار نہیں۔ روز روز حالات بگڑتے جا رہے ہیں۔ میرا مان لیا ہوتا تو کم از کم ہفتہ کی بچت ہو جاتی۔ کفایت شعاری سے کام لیتی تو فکر کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ خواہ مخواہ کل کے ایک معمولی خواب پر اتنا گھبرا گئی اور دو تین سیر چاول کبوتروں کیلئے زیارت گاہ میں چھوڑ آئی۔ میں مرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ اس سے پہلے تجھے رانی کی طرح ڈھیر ساری خوشیاں دوں گا۔ اپنے خدا پر بھروسہ رکھو وہ بڑا مہربان ہے۔" دلاسہ دیتے ہوئے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا اور سوچتا رہا

اس کا قصور اتنا کہ پچھلے ایک گھنٹہ سے رو رو کر غزالہ نے خود کو بالکل نڈھال کر دیا تھا۔ اسکی سوچ میں خوف بھرا ہوا تھا۔ پہلے اسکے بدن میں ماں کا درد بھرا دل تھا بعد میں وہ ایک بیوی کی طرح اسکے جھانسے میں آسکتی تھی۔

"اتنی بڑی رات کیسی گزر جائیگی۔ فاقے پر نوبت آ گئی ہے۔ اللہ کے سوا گھر میں کچھ نہیں۔"

وہ اپنے کئے سے باز نہ رہی۔ روہانسی آواز میں شکایتوں کا پٹارا کھول بیٹھی تھی۔

کچھ سوچ لو کیا، یونہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھتے رہو گے۔" وہ شرارتی نظروں سے گھورتے ہوئے دوبارہ بولی۔

"نوردین اور سلام بٹ سے پوچھ لیتے ہیں۔ بس ایک دو دن کی بات ہے۔"

"خود جا کر پوچھ لینا۔ اب مجھ سے نہ ہوگا۔ پہلے ہی میں پانچ سیر چاول کی

قرض دار ہوں۔"

شمس الدین سے رہا نہ گیا۔اٹھ کھڑا ہوا۔آہستہ سے کھڑکی کا پٹ کھول دیا۔سامنے سلام بٹ کے مکان کی کھڑکی کو دیکھتا رہ گیا۔۔ان کے صحن کی طرف وہ ہمیشہ کھلی رہتی تھی نجانے آج کیوں بند پڑی تھی۔

"سلام بٹ۔سلامہ! کھڑکی سے ذرا دیکھ لے۔خدارا میری ایک بات سن لے۔"

اپنے کمرے کی کھڑکی سے شمس الدین کافی دیر سے سلام بٹ کو پکارے جا رہا تھا مگر کھڑکی کا پٹ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی ہلنے کا نام لے رہی تھی۔

"کیوں سلام بٹ سلام بٹ کی رٹ لگا رکھی ہے۔ باہر سڑک پر سپاہی گشت کر رہے ہیں۔"

نہ جانے کس بُرتے میں شمس الدین کچھ سوچتے ہوئے آندھی کی طرح کمرے سے باہر آ گیا۔

غزالہ...... کمرے میں بکھری چیزوں کو سمیٹنے لگی۔آنسوؤں سے تر چہرے کو دھولیا اور پھر تولیہ سے صاف کیا۔وہ خود کو کسی ٹوٹی ٹہنی کی طرح محسوس کرتی ہوئی شمس الدین کا انتظار کرنے میں لگ گئی۔اُسے اپنی کہے پر ندامت محسوس ہونے لگی۔ایک یا دو دن بھوکا و پیاسا رہ کر کوئی مرتا تو نہیں۔وہ اتنا بھی سہہ نہ سکی۔

اسی اثناء میں دوسرے کمرے سے بچوں کے شور وغل نے ایک طوفاں سا برپا کر دیا تھا۔غزالہ دوڑی دیکھنے چلی آئی کہ کیا ماجرا ہے یہ دیکھ کر دنگ رہ گئی کہ بچے ڈنڈے لیکر کھڑکی کے پٹ پر بیٹھے موٹے تڑکے کوے کو بھگا رہے تھے۔لیکن وہ کمرے کے اندر چلا آیا اور اپنی کھلی چونچ لئے دوڑنے کو آتا اس کے ارادے ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔سامنے بے حال چڑیا قرآنی آیات جڑے ہوئے فریم کے اوپر کافی گھبرائی ہوئی شور سے سر پر آسمان اٹھائے واویلا کر رہی تھی۔کمرے کے ایک کونے میں اسکے دونوں چوزے دبک کر چیں چیں

کی آوازیں نکال رہے تھے۔غزالہ نے ڈنڈا اٹھا کر فوراً کوے کو مار بھگایا۔

شام اترنے کو آئی۔ انتظار کرتے کرتے غزالہ بے آب مچھلی کی طرح تڑپتی رہی۔ پھر بھی اس کا تڑپانے والا واپس لوٹا نہیں۔ باہر ہر سو پہرے لگے تھے کہ پرندہ تک پر نہیں مار سکتا ان حالات میں اُسے ڈھونڈ پانا مشکل تھا۔اسکے ذہن میں طرح طرح کے بُرے خیالات اور وسوسے طاری ہو گئے۔

رات کو بھوک سے ستائے ہوئے بچوں کے شور وغل نے غزالہ کو ٹی وی آن کرنے پر مجبور کر دیا تا کہ ان کا دل بہل جائے یہاں تک کہ نیند کا غلبہ ہونے پر آسانی کے ساتھ سو سکیں۔

اتفاق سے ٹی وی پر خبر نشر ہوئی۔ بچے یہ دیکھ کے حیران رہ گئے اور پاپا کا نام کی رٹ لگانے لگے۔مقامی چینل میں خبروں کے دوران پولیس کی ایک چھوٹی سی ٹکڑی کے گھیراؤ میں شمس الدین کو دکھایا جا رہا تھا اسے ایک بدنام دہشت گرد قرار دے کر اُسکے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی گئی تھی۔ کندھے پر اے, کے, سنتالیس AK-47 لٹکائے ہوئے سامنے فرش پر چاول بھرے تھیلہ میں دو بموں کی موجودگی کا بیان آرہا تھا۔

نمک حرام

''پکڑ لے سالے کو کہیں وہ بھاگ نہ جائے۔''

''حرامی۔ کتے کی اولاد''۔

''وہ کوئی چور یا لفنگا ہے۔''

''اس حرام زادہ بدمعاش کی کیسے ہمت ہوئی جو اس بستی میں چلا آیا''۔

جتنے منہ اتنی ہی اس سے زیادہ موٹی موٹی گالیاں۔

ساری بستی مشتعل تھی ہر چھوٹا بڑا آدمی ہاتھ میں لاٹھی ڈنڈا اور پتھر اٹھا کر دور تک اس کا پیچھا کرتا رہا۔ پیچھا کرتے کرتے انہوں نے کئی چھوٹے موٹے پتھر بھی پھینکے۔ لیکن وہ اپنے آپ کو بچاتا خرگوش کی طرح منڈھیروں کو پھلانگتا ہوا ہموار پگڈنڈی پر بے خوف بھاگتا رہا۔ یہاں تک کہ دھان کی لمبی لمبی گھاس کی اوٹ میں چھپ کر ان کی نظروں سے غائب ہوا۔

وہ بھاگتا جا رہا تھا۔ ہانپتا ہوا اچانک ندی کے اس پار چلا آیا۔ مڑ مڑ کر دیکھا تو وہاں اب کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ صرف وسعت نظر تک دھان کے لہلہاتے ہوئے کھیت نظر آرہے تھے ۔وہ کھیت کے اس حصے کے الگ تھلگ ویران گوشہ کی طرف چلا آیا جو برسوں سے غیر آباد اور خشک پڑا تھا۔ جسے گاؤں والوں نے سخت اور پانی کی کمی کی بناء پر بے کار اور بنجر چھوڑ دیا تھا۔

اچانک اسکے دوڑنے کی رفتار سست پڑ گئی۔ پاس ہی ایک خستہ اور بوسیدہ پیڑ کے قریب آکر اس نے بستی کی طرف دوبارہ حقارت بھری نگاہ ڈالی۔ چار سو خاموشی دیکھی تو اسے

تھوڑا سا سکون ملا۔ سنبھل کر آس پاس بیٹھنے کی جگہ ڈھونڈنے لگا...... گھاس پھوس ہٹا کر تھوڑی سی جگہ بنا ڈالی پھر آنکھیں بند کر کے چند لمحوں تک سوچتے سوچتے اپنے آپ کو کوستا رہا۔ اُسے کیا لت پڑی تھی اس بستی میں جا گھسا کہ الٹی آفتیں گلے پڑ گئیں۔

تھوڑے سے فاصلہ پر اسے دیکھتے ہی وہاں سے کئی گدھ۔ چیل اور کوے کائیں کائیں کرتے ہوئے اڑ گئے۔ چند ساعت تک ان کے پھڑ پھڑانے کا شور خوب اٹھا۔ ان میں سے کئی تھوڑی سی پرواز لے کر پھر اپنی جگہ پر لوٹ آئے اور کئی آس پاس درختوں کی ٹہنیوں پر آ کر بیٹھ گئے۔

دیکھا تو وہ کسی مردہ جانور کا گوشت نوچتے رہے تھے۔ دو تین مریل کتے پاس ہی کھڑے بار بار ان کو کاٹ کھانے کو دوڑتے اور وہ خطرہ محسوس کرتے ہوئے ایک جگہ چھوڑ کر دوسری جگہ پر آ کر بیٹھ جاتے۔ کوئی حد مقرر نہیں۔ جسے جتنا چاہیئے کھائے جاتا تھا۔ جدھر جی چاہیئے۔ فضا میں اڑ کر سانس لینے کی بھر پور آزادی تھی۔ بھلے مانس پر جیسی کوئی پابندی نہیں......

وہ کافی تھک چکا تھا۔ مایوس پژمردہ اور نڈھال لگ رہا تھا۔ اسکی بوریت آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ پیڑ سے پشت ٹیک کر اس نے پاؤں پسارے پلکیں بھی گرا دیں پھر بھی نیند اسکی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ جس شدت سے بھوک ستانے لگی۔ اسی شدت سے پیٹ میں درد انگڑائیاں لیتا رہا۔ کراہ سا اٹھا۔ جیب میں ہاتھ ڈالا وہ بھی خالی پائی۔

اس کی شکستہ حالی کا یہ عالم تھا کہ وہ سر سے پاؤں تک بالکل چھتڑوں میں لپٹا تھا۔ ننگے پیر اور جین پتلون بس جگہ جگہ ٹانکے اور پیوند لگے تھے اور کئی چھوٹے چھوٹے شگاف بھی پڑے تھے۔ جن سے رانوں کا میلا کچیلا گوشت صاف نظر آتا تھا۔ میلی شرٹ بھی کئی جگہوں پر پھٹی پھٹی اور سرسوں کے تیل سے میلی لگ رہی تھی۔ الجھے ہوئے گھنگھریالے گرد آلود بال جو برسوں سے تراشے نہ گئے تھے۔ اور سیاہ ہونٹوں پر موٹی موٹی پپڑیاں جمی تھیں۔ آنکھوں کی سرخی مائل رنگت میں ایک لمحہ کے لئے مایوسی اور بے بسی کی پرچھائیاں دکھائی دیتی تھیں۔

پرندوں کی پھڑ پھڑاہٹ اور کتوں کے بھونکنے کی آواز سے وہ چونک سا پڑا۔ ہڑ بڑا کر پاس ہی پڑا ایک چھوٹا سا پتھر اٹھالیا اور ایک وزنی سی گالی دے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ چند قدم آگے بڑھا تو ایک کتے کے سر پر دے مارا۔ سارے کتے بھونکتے ہوئے پیچھے ہٹ گئے۔ ایک دبی سی مریل سی کتیا پاس ہی پگڈنڈی کے قریب آکر رکی۔ اور تکتی رہی۔ سارے پرندے پھر سے اڑ گئے۔ تھوڑی سی اڑان لی اور لوٹ کر پھر واپس اپنی جگہ پر آ گئے۔

لاش بوسیدہ ہو کر سڑ چکی تھی۔ دم گھٹتی ہوئی بدبو اس کی نتھنوں میں اتر گئی۔ اس کے چلنے کی آہٹ پاتے ہی مچھر مکھیوں کی بھنبھناہٹ میں بھی تیزی آ گئی۔

ادھر مردہ جسم پر نظر پڑی تو خالی پیٹ سے متلی آتے آتے رک گئی۔ کئی ٹکڑوں میں بکھرے جسم سے ایسا معلوم پڑتا تھا کہ وہ کسی کتے کی ہے۔ لیکن جس بات پر اسے تعجب ہو رہا تھا کتے لاش کے گرد ماتم کناں اپنی برادری ذات کے گوشت کا نوالہ نہیں بنا رہے تھے۔ کسی بزرگ کا مقولہ سچ ثابت ہوا کہ کتا دوسرے کتے کا گوشت نہیں کھاتا ہے" جبکہ وہ خود...... صرف ایک چپاتی کے لئے غیظ و غضب کا شکار بنا۔ نفرت سے ہونٹ سکوڑ لئے اور گالی دیئے بنا ءنہ رہا۔

گدھ، چیل اور کوے مردہ گوشت سے خوب شکم سیر ہو کر اڑان بھر رہے تھے اور کچھ مہمان پر ٹوٹ پڑنے کے لئے پر تول رہے تھے۔ تھوڑی دیر تک وہ دیکھتا رہا۔

اس کی طبیعت میں پھر جھنجھلاہٹ پیدا ہوئی کہ اس نے دوسرا پتھر اٹھالیا اور سیدھے ایک کوے پر دے مارا جس سے وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

اچانک ایک کہرام مچا۔ دیکھتے دیکھتے ہی کوے اتنے بگڑ گئے کہ کائیں کائیں کرتے ہوئے چار سو سینکڑوں کی تعداد میں اڑان بھرتے ہوئے امڈ پڑے۔ ملحقہ کھیت کی منڈھیروں، پیڑ کی ٹہنیوں، پگڈنڈی، پتھر کے ڈھیلوں اور بنجر زمین کے چپہ چپہ پر سیاہ چادر کی پرت در پرت کی طرح دکھائی پڑے۔

پاس ہی ایک عینی گواہ شرارتی کوے سے رہا نہ گیا تو بدلہ لینے کی پہل میں اس کی پہلی ٹھونگ سے شروع ہو کر آناً فاناً ایک اڑتا ہوا غول اس پر جھپٹ پڑا۔ جس نے جہاں چاہا وہاں چونچ مار کر جیسے دوستی کا حق ادا کیا۔ جبکہ اکثر آدم ذات اپنوں کو مصیبت میں دیکھ کر یوں منہ پھیر لیتے ہیں جیسے اپنے بھائی بندوں سے کبھی واسطہ نہ رہا ہو۔

وہ غصے سے پھٹ پڑا۔ ایک خشک ٹہنی کو لے کر مارتا ہوا دور تک انہیں بھگاتا دوڑتا رہا پھر موقعہ پاتے ہی وہاں سے ایسا رفو چکر ہو گیا کہ جیسے کوئی قید سے فرار ہو گیا ہو۔

وہ بھاگا اور بھاگتا رہا۔ یہاں تک کئی کھیتوں کی منڈھیروں کو عبور کرتا ہوا ایک سنسان سڑک پر آ گیا۔ کئی ضدی کوئے دور تک اس کا تعاقب کرتے رہے پھر تھک کر جب وہ یکے بعد دیگرے کہیں آسمان کی وسعتوں میں بکھر گئے۔

تو اس نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی۔ گویا کسی ناگہانی آفت سے خلاصی پائی ہو۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اب وہ بازار کی طرف چل پڑا۔

بازار کی گہما گہمی پورے شباب پر تھی۔ لوگ اپنی دھن میں مست تھے۔ سجی سجائی دکانوں میں برقی قمقموں کا ایک جال سا بچھا لگا تھا یوں کہ وہ سجاوٹ اور خوبصورتی میں کسی دلہن سے کم نہ دکھائی پڑتے تھے۔ رنگ برنگ کی آرائشی چیزیں قد آدم شیشوں سے جھانکتی تھیں۔ وہ ان کی بھرپور نمائش کو نظر انداز کرتا رہا۔ چٹ پٹے فلمی گانوں کی بہتات اور گاڑیوں کے چلنے کے شور و غل میں بھاگتا ہوا قریب ہی ایک ڈھابہ گلی میں جا گھسا تھا۔

گلی میں آ کر لذیذ پکوانوں کی خوشبو اس کی نتھنوں میں گھس کر خالی پیٹ میں جیسے بھوک نے پھر نیم برہنہ نوخیز کلی کی طرح بھرپور انگڑائی لی۔ بھوک بڑھ گئی۔ بھوک سے اس کی انتڑیوں میں اٹھین پڑ رہی تھیں اور بھوک میں اتنی شدت کہ گویا بڑی آنتیں چھوٹی چھوٹی آنتوں کو کھا رہی ہوں۔

بے خیالی میں اس نے جین پتلون میں ہاتھ ڈالا تو جیب میں ایک دھیلا تک نہ پایا۔

خالی جیب اور بجھی بجھی سی نظروں میں لذیذ کھانے کے برتنوں سے آنکھیں چرا کر بھی منہ سے رال ٹپکتی کہ حلق سے نیچے انڈیل دیتا تو شاید اس کی تھوڑی سی بھوک مٹ بھی جاتی۔ وہ تلملا اٹھا۔ مارے کوفت کے بُرا سا منہ بنالیا۔ پوری جھاگ بھری پڑی تھوک منہ کی پاس ہی سیمنٹ پردے ماردی۔

نڈھال اور شکستہ حالت میں اس نے کئی ڈھابوں کے چکر کاٹ لئے۔ سارا جسم کچے پھوڑے کی طرح دکھنے لگے اس کے حواس گم کر ہو گئے تھے۔ معدے میں جیسے کسی نے انگارے بھر دیئے ہوں وہ ہونقوں کی طرح دیکھتا ہوا ٹھنڈے پسینے سے بھیگتا رہا۔

سلیقے سے انہوں نے دکانوں کے باہر لکڑی کے تختہ پر قرینے سے سجی سجائی طرح طرح کے تانبے کی دیگچیوں میں گوشت سے بنی ضیافتیں رستے، گشتابے، روغن جوش یخنی، آب گوش اور دیگر سبزیوں کے علاوہ ایک بڑی ٹرے میں کباب اور موٹی موٹی تازہ روٹیاں قطار در قطار دیکھیں تو سب کھانے کو جی چاہنے لگا۔ ایسا منظر دیکھنے والے کے منہ میں بھی پانی بھر لاتا ہے اور پل بھر معدے میں جیسے چوہے آنکھ مچولی کھیلتے۔

دکانوں کے باہر جلتے ہوئے کوئلے کی انگیٹھی پر ایک چمکیلے سیاہ بڑے سے توے پر گرم گرم حلوے اور سموسوں کو اس کی نظریں تکتی رہیں۔

''کیا چاہیئے بیٹا......''

''کئی دکانوں سے بار بار ایسا ہی سوال پوچھنے پر وہ گرم گرم تیل کی کڑھائی میں مچھلی جیسا تڑپ اٹھتا تھا۔

''کچھ بھی نہیں'' ......اس کی نحیف آواز سنائی دیتی۔ ......چل نکل یہاں سے۔''

''ایک روٹی چاہیئے۔ دو دن سے بھوکا ہوں۔ بھوک لگی ہے۔''

چل بھاگ شرم نہیں آتی بھیک مانگتے ہوئے ہٹے کٹے جوان ہو تم۔

''صرف ایک چپاتی......''

جا کوئی کام ڈھونڈ لے سالے" ڈھابے والا اسے مشکوک نظروں سے دیکھتا رہا۔ اسکی آنکھوں میں تو جیسے کانچ بھرا ہوا تھا اس کی وضع قطع بالکل ایک بھکاری سے بد تر لگ رہی تھی۔

وہ سوچتا رہا۔ اس کا کلیجہ منہ کو آرہا تھا۔ اسکے اپنے گذرے سارے بیتے لمحے قطار در قطار اس کے سامنے آن کھڑے ہوئے تھے۔ تین کپڑوں میں اُسے گھر سے نکال دیا گیا تھا۔

"لگتا ہے کوئی لفنگا گھٹیا قسم کا آدمی ہے تو......"

بھیا "بس ایک چپاتی۔" اس سے رہا نہ گیا۔

اس نے عاجزی سے پھر وہی سوال دہرایا۔

"ہٹو یہاں سے" اس بار لالہ کڑک کر بولا۔

"ایشور کے نام پر ہی۔"

"بدمعاش کہیں کے۔ باپ کا مال سمجھ رکھا ہے۔

وہ ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹا۔

"ابھی تُو بھاگا نہیں یہاں سے تو پھر بیچ راستہ روکے یوں کھڑا کیوں ہے"

لالہ کا غصہ سمندر کی طرح جاگ اٹھا...... تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔

"سالے تو نہیں دے گا تیرا باپ دے گا۔ زندگی میں پہلی بار ایشور کا نام لیا اوپر سے گالیاں کھانی پڑیں......" تیری ایسی کی تیسی تمہارا کچومر انکالنا پڑے گا۔

اس کی بات نے گویا مزید اس کے کانوں میں پگھلتا ہوا سیسہ انڈیل دیا تھا۔ اسے اندازہ ہوا کہ اب اسکی بھوک مزید تیز ہو گئی ہے۔

ایک دم آپے سے باہر ہو کر اس نے تازہ روٹیوں پر ایسا ہاتھ دے مارا کہ جھپٹ میں دو تین روٹیاں ہاتھ آئیں......"

پکڑو اس حرام زادے کو...

لالہ طیش میں آگیا اور اس کی آواز کا جیسے دھماکہ گونجا۔

سامنے ڈھابے کے اندر چند گاہک کھانے میں مشغول تھے۔ سنتے ہی بغلیں جھانکنے لگے۔ احمقوں کی طرح اُسے دیکھنے لگے۔ پلک جھپکتے ہی کچھ راہگیر اس پر ٹوٹ پڑے انہوں نے آو دیکھا نہ تاؤ۔ اتنا مارا کہ اسکی ٹانگوں میں جیسے جان ہی نہیں رہی تھی اور وہ وہاں سے بھاگ نہ پایا۔

دھنیگا مشتی میں نئی نئی قسم کی صلواتیں اور غیظ وغضب کا شکار ہوکر وہ لہولہان فرش پر ادھ مرا گر پڑا۔ ان کی شکلوں سے خباثت ٹپک رہی تھی۔

"سالا! حرام خور مر گیا شاید۔"

"نہیں! ڈھونگ رچا رہا ہے۔"

کئی آدمیوں نے اپنی رائے دے دی۔"

اس کی ناک سے خون کی ایک پتلی سی لکیر بہہ رہی ہے۔"

"بہنے دو۔" بھیڑ میں کوئی بولا تھا۔

مار سے اس کا بدن زرد پڑ گیا تھا...... سر پر کافی چوٹیں آنے سے گرد آلود بال خون سے گیلے ہوتے ہوئے دکھائی دیئے گویا وہ ابھی ابھی کسی تالاب سے نہا کے آیا ہو۔ شرٹ بالکل چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ کر لوگوں کے جوتوں تلے روندی گئی تھی ۔ پھٹا کالر ابھی بھی اس کے گلے میں لٹک رہا تھا۔

ساری جگہ خون سے لت پت ہوگئی تھی۔ جگہ جگہ خون کے دھبے بتا رہے تھے کہ انہوں نے کسی گندم خور کو نہیں آدم خور کو پھاڑ ڈالا ہے۔

..............☆☆☆..............

باغی ستارہ

شاید قدرت کو یہی منظور تھا۔

آصف علی جس بستی میں رہ رہا تھا۔ دوسروں کی بہ نسبت وہ کافی پچھڑی ہوئی اور پسماندہ علاقوں میں شمار کی جاتی تھی۔ زیادہ تر لوگ ان پڑھ ہی تھے۔ پچھلی کئی صدیوں سے یہاں موروثی پیشے نے ہی اپنا غلبہ جمائے رکھا تھا۔ صرف اکا دکا پڑھا لکھا سرکاری اور نجی اداروں میں فورتھ کلاس ملازمت کرتا تھا۔ بستی کوئی پچاس ساٹھ گھروں پر مشتمل تھی اور اسی بستی میں آصف علی کا بھی گھر تھا۔ آصف علی جسے لوگ اب صرف مزاری کے نام سے پکارتے تھے۔

غریبی ایک ایسی بدذات ڈائن ہے جو سالہا سال جوان، سدا بہار اور پُر شباب لگتی ہے۔ نہ کبھی مرتی ہے اور نہ کبھی لاغر و ضعیف ہونے کا نام لیتی ہے۔ ہنستے کھیلتے گھروں کو اُجاڑنے میں اُس کا کوئی ثانی نہیں۔ مایوسی، ناکامی اور شکستہ حالی اُس کی پہچان ہے۔ جسے دبوچتی ہے پچھاڑ دیتی ہے۔

آصف علی بھی جب اسی روگ کا شکار ہو گیا تو آہستہ آہستہ اُس کا لمبا چوڑا نام گھٹتا چلا گیا۔ وہ کشمیری شال پہ سوزنی کا کام کرتا تھا۔ اس میں اُسے کافی مہارت حاصل تھی۔ اُس میں شرافت جیسے کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ کوئی مل جاتا تو وہ ایسے انداز میں پیش آتا جیسے اُس پہ اپنا سب کچھ نچھاور کرنے جا رہا ہو۔ مگر اُس کے پاس تھا ہی کیا۔

اُس کی بیوی نسرین، جسے خوبصورتی جیسے مانو دان میں ملی تھی۔ تنومند و جوان، اُس سے عمر میں ذرا سی بڑی۔ چھ ساتھ جماعتیں پڑھی ہوئی۔ شوہر کی نظر میں شاطر اور باتونی۔ لیکن پرلے درجے کی فضول خرچ۔ اب تک دو بچوں کو پیدا کر چکی تھی۔ اُن سے بے حد پیار کرتی تھی، باقی جو رہ گیا وہ شوہر کی خدمت کے لئے تیار کوئی موقع قرب حاصل

کرنے سے نہیں چوکتی تھی۔ دوشیزگی بدن میں ابھی تک تپش بجھی نہ تھی جیسے تپتے تن پہ کوئی بوند پڑتی تو فوراً چھن سے سوکھ جاتی۔

بڑے بیٹے کو قمر اور چھوٹے کو ثمر کہکر پکارتی۔ آصف علی گھر میں پاپا کہلاتا تھا۔

اکثر دونوں ننھے منے پہلوان اکھاڑے میں اُتر کر بات بات پہ ایک دوسرے کو چت کرنے کے داؤ کھیلتے ہوئے نظر آتے تھے۔ نسرین کو اکثر آصف کے گھر سے بنا کوئی ناشتہ کیئے باہر کام تلاش کرنے کی غرض سے نکلنے پہ اکثر رنج ہوتا تھا...... اکثر دن بھر کی تھکان کے بعد جب آصف گھر لوٹتا تو تھکان سے اس کا بُرا حال ہوتا تھا۔

ایک دن ایسے ہی اُس کی آنکھیں بوجھل ہوری تھیں کہ نسرین گہری سوچ سے اُبھر کر اُس سے مخاطب ہوئی۔

''آج صبح ارشد بھیا سے تھوڑا قرض لینے کا پھر خیال آیا تھا۔ اب گھر مشکل سے چلتا ہے۔ اس سال جاڑا ابھی وقت سے پہلے جیسے ہمیں مارنے آیا ہو جیسے....

اُس کی بات نے آصف کو چونکا دیا گویا کسی نے پانی سے بھری بالٹی اس کے اوپر انڈیل دی ہو۔ وہ تلملا اُٹھا۔

''تھوڑی بہت شرم کر...... بار بار میکے جا کر ہاتھ پھیلانا اچھا نہیں۔''

''کاہے کی شرم۔ کس سے شرمانا۔ اپنے ہیں۔ کوئی غیر نہیں ہیں۔''

''پھر بھی تمہیں میری عزت کا......'' آصف دانت پیستا رہ گیا۔

بات آئی گئی تو نہ تھی لیکن موسم تھا کہ اپنے بدلتے تیوروں کے ساتھ جانے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ آصف کو یوں تو کئی برسوں سے زندگی کی اس سردی اور خشک ہواؤں کا سامنا ہی کرنا پڑ رہا تھا۔ بڑے پاپڑ جھیلتا ہوا جی رہا تھا۔

ان حالات میں نسرین اکثر رحیم درویش کے پاس جایا کرتی تھی۔

رحیم درویش کی اپنی ایک الگ کہانی تھی۔ وہ غم گسار، ملنسار اور ہنس مکھ طبیعت کا

سرکاری نوکری سے سبکدوش ہوتے ہی نہ جانے کن اچھے لوگوں کی صحبت میں دن گزارنے لگا تھا۔ وہ اکثر بستی کے کاموں میں دلچسپی لیتا۔ اُس سے کسی کا دکھ دیکھا نہیں جاتا تھا۔ اُس کی معمولی سی ذہانت نے اُسے دیکھتے دیکھتے ہی بستی کا مشہور درویش بھی بنادیا۔ بڑے بزرگوں کا کہنا ہے کہ ایک دن بستی میں کھیلتے کھیلتے ایک بچہ کہیں گم ہوگیا، جب دیر شام تک گھر نہیں لوٹا تو محلے والے اُسے ڈھونڈنے نکلے۔ بسیار تلاش کے بعد اُسے نہ پاکر کسی نے یونہی رحیم درویش سے پوچھا، اُس نے کہا کہ وہ کہیں سویا پڑا ہے...... بعد عصر کئی چھوٹے چھوٹے بچے مسجد کے پچھواڑے کھیلنے گئے تو اُنہوں نے گم شدہ بچے کو وہیں سویا ہوا پایا۔ یہ خبر جنگل کے آگ کی طرح پوری بستی میں پھیل گئی۔ رحیم بٹ ''رحیم درویش'' ۔ کے منہ سے نکلی ہوئی بات سچ ثابت ہوگئی۔ یک لخت اُس کی دنیا بدل گئی۔ وہ لوگوں کی نظروں میں پہنچے ہوئے درویش کا مقام پاگیا۔ قیاس کی بنیاد پر اُس نے اپنی بستی میں تہلکہ مچادیا ورنہ وہ پولیس محکمے کا بھگوڑا حوالدار تھا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب نسرین آصف کے گھر نئی دلہن بن کر آئی تھی۔

پندراں سولہ برسوں میں آصف علی کے گھر پر کیا کیا گزری وہ وہی جانتا تھا۔ بڑی مشکل سے گھر گھر ہستی چل رہی تھی۔ اب اُس کے سوز نکاری کے وہ اچھے دن بھی نہیں رہے تھے اب کبھی کبھار فاقوں کی نوبت بھی آنے لگی تھی۔ اب نسرین کو اپنے بچوں کی صبح شام فکر ستانے لگتی تھی۔ ایسے ناموافق حالات میں نسرین کو دماغ اندیشوں کی آماجگاہ بننے لگا تھا۔ بچوں کی شفقت نے جیسے اُسکے سارے ذہن کو ماؤف کردیا۔ اُن کی ضد کے سامنے وہ اپنی زندگی کو بھی داؤ پر لگانے کے لئے تیار ہوجاتی۔

اب وہ رحیم درویش سے کاروبار کے نام پر کچھ قرض لینے کے بارے میں سوچ رہی تھی کیونکہ رحیم درویش محلے کا سرپرست ہونے کے ناطے مسجد کی فنڈ کمیٹی کا بھی سربراہ تھا اور اکثر مستحق افراد میں بنا سود کا قرضہ بھی دیا کرتا تھا...... نسرین کو اگر اُلجھن تھی تو بس

آصف علی کے انکار کی......

اس دوران آصف علی نے ایک خواب دیکھا تھا، شفق کی بانہوں میں اُبھرتا ہوا سورج..........

اور جب

آصف علی کو ایک پرانے مہاجن نے یہ اطلاع دی کہ کسی فرہنگی نے نمونے کے طور پر ایک کشمیری شال پر ڈیزائین دار جالی منگوائی ہے۔ تو آصف کو جیسے اپنے خواب کی تعبیر نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ مہاجن سے ملنے کے لئے دور دراز گاؤں کی اور روانہ ہوا۔ آرڈر سے متعلق کچھ باتیں طے کرتے کرتے اور وہاں سے گھر لوٹتے وقت میں بہت دیر ہونے کے پیش نظر وہ رات کو وہیں رک گیا۔ ویسے بھی اُس گاؤں سے دیر رات واپسی کی کوئی سواری ملنا مشکل ہی تھا۔ دوسرے دن کچھ ہزار روپے پیشگی رقم لیکر جب اُس نے اپنے گھر کی دہلیز پہ قدم رکھا تو آصف علی کو پہلی بار زندگی میں ایک حیران کن جھٹکا لگا۔ جیسے وہ اُڑتے اُڑتے آسمان کی وسعتوں سے نیچے گر گیا ہو۔

گھر میں سب کچھ پکا پکایا تیار تھا......اور اُس کے بیٹے ثمر نے رات دیر گئے بستر پر سوتے سوتے جو بات سرگوشی میں اپنے باپ سے کہی تھی اُس کو سننے کے بعد اُسے اپنے خواب کی سچی لیکن......تعبیر سامنے نظر آئی۔

اُسکی بیوی نسرین شفق بن چکی تھی اور رحیم درویش شمسی باغی ستارہ۔

...............☆☆☆...............

تخلیق کا کرب

آج......

وہ پھر پہاڑی کی چوٹی پر وادی کے ان لہلہاتے ہوئے کھیتوں کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ جو حدِ نظر تک پھیلے ہوئے تھے۔ ماضی کی یادیں رہ رہ کر اسکے ذہن کے کینواس پر رینگنے لگیں اور وہ محسوس کرنے لگا۔ جیسے اسکے جسم میں خون کی رفتار اچانک تیز ہوگئی ہو۔ نظامِ تنفس میں انتشار سا آگیا ہو۔

اس نے تہیہ کرلیا تھا کہ کسی صورت وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے اُسے سب کچھ سنا دے گا اور اپنے گناہوں کا اعتراف خود کرلے گا لیکن احساس گناہ کچھ اس طرح سے حاوی تھا کہ وہ اپنے ہونٹوں کو خفیف سی جنبش دینے کے سوا اور کچھ نہ کرسکا۔ جیسے اسکی کھوکھلی آواز حلق کے درمیان نوک دار ہڈی کی طرح اٹک کر رہ گئی ہو۔

وہ کتنی دیر تک اسکے چہرے کے اتار و چڑھاؤ کو دیکھتی رہی اور عجیب سی بوریت محسوس کرنے لگی۔ اسکے ذہن میں لاتعداد وسوسے اور خدشے جنم لے رہے تھے۔ آخر گھبرا کر اُسے اپنی طرف کھینچ کر پوچھنے لگی۔

"آصف! یہ تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ کیا سوچ رہے ہو۔ کچھ بتاؤ گے بھی۔"

"ریحان! تم خواہ مخواہ شک میں پڑ جاتی ہو۔ زندگی میں تم ہو تو پریشانی کیسی۔"

اس بار آصف نے ایک قہقہہ لگایا اور بڑے پیار سے ریحانہ کو اپنے بازوں کی مضبوط گرفت میں لے لیا۔

"اوئی اللہ۔ شرم بھی آتی نہیں۔ کوئی دیکھ لے گا۔ وہ دیکھو چرواہے سامنے اپنی بھیڑوں کو چرا رہے ہیں۔

ریحانہ کے پھول سے گالوں پر سرخی دوڑ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔

وہ بے سدھ سا سو گیا۔ ریحانہ کا وجود شہد کی مانند اسکی نس نس میں اترتا محسوس ہو رہا تھا۔

''کچھ بتاؤ بھی آصف! میں تمہارے چہرے پر غم کی لکیریں نہیں دیکھ سکتی۔''

''کوئی خاص بات نہیں ہے ریحان''۔

وہ پھر اپنے خیالات کے گہرے سمندر میں ڈوب گیا۔ اس نے گھر ہی پر یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ریحانہ کو سب کچھ بتا یئے گا۔ مگر یہاں پہنچ کر کوئی غیبی طاقت اُسے کچھ بتانے سے روک رہی تھی۔

اس کے سینے میں زہر کے بجھے تیروں کی دردناک چبھن سی محسوس ہو رہی تھی۔ اسکی نظریں پھر پہاڑی کی ڈھلوان پر مرکوز ہو گئیں۔ جہاں اس نے کئی راتیں اپنی محبوبہ کے پہلو میں گزار دی تھیں۔

یہی وہ ٹیلہ تھا۔ جہاں دیر تک وہ اسکے لب ورخسار سے کھیلتا رہتا تھا۔ اسکی سانسوں کے زیر و بم میں کھو جایا کرتا تھا۔

لیکن ایک دن اپنی ناکامیوں سے تنگ آ کر اُسے پہاڑی پر لے آیا تھا اور پھر اپنے تمام وعدوں اور قسموں کو توڑ کر اچانک ہی اس نے پہاڑی کی بلندی سے اُسے نیچے کھائی میں دھکیل دیا تھا۔

چند لمحوں بعد اسکے سامنے اپنی محبوبہ کا مرمرین بدن سرد پڑ چکا تھا۔ وہ پتھرائی آنکھوں سے اُسے گھور رہی تھی۔ جیسے سوال کر رہی ہو۔

''میرے خالق! آہ! تم نے یہ کیا کیا۔ کیوں کیا۔ کیوں......؟''

اور پھر وہ اس لاش پر ایک حیرت ناک نگاہ ڈالے بوجھل قدموں سے گھر لوٹ آیا تھا وقت گزرتا گیا۔ دن سرکتے گئے۔

محبوبہ کی جگہ اب اسکی حسین ترین بیوی ریحانہ نے لے لی تھی۔ جسے وہ انتہائی پیار سے ریحان کہا کرتا تھا۔ وہ اسکی اداس اور بے کیفیت زندگی میں بہار کا ایک سردوں گزار جھانکا بن کر آئی تھی۔ اور جس نے اسکے دردو کرب کو مٹا کر اپنے پیار کے کومل سائے میں پناہ دی تھی۔

آصف! تمہیں میری...... ''اور اس سے پہلے کہ وہ اپنی جان کی قسم کھا کر اُسے مجبور کرتی۔ آصف نے فوراً کہا۔

''ریحان ادھر دیکھو......'' اور وہ اُسے ایک بڑے سے پتھر کے قریب لے گیا۔ نیچے گھاس اور پتھروں کے درمیان پھٹا پرانا سرخ ریشمی لباس تھا۔

''جانتی ہو یہ کون ہے۔ میری زندگی میں تمہارے آنے سے قبل یہی میری محبوبہ تھی۔''

ہاں ریحان سچ۔ جو میری ہر تخلیق ہی میری محبوبہ ہوا کرتی تھی۔ جسے میں ہر زاویہ نگاہ سے گھنٹوں دیکھتا رہتا۔ اُسے سجاتا اور سنوارتا، اس سے بے پناہ پیار کرتا......

اب میں زندگی بھر تم دونوں کی رفاقت اور محبت سے سرشار ہوتا رہوں گا......!!

چھیتڑے کی ملکہ

بابو.جی......!

میں نے پیچھے مڑکر دیکھا تو میرے رونگھٹے کھڑے ہوگئے۔ میں مشکوک نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ مجھے گھور گھور کر دیکھنے لگی۔ جیسے وہ میری کسی غیر مہذب حرکت پر شک کرنے لگی ہو۔ جب اس کا شک یقین میں بدل گیا تو اس نے اپنی صراحی دار گردن جھکالی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے خود اپنے جرم کا اعتراف کیا ہو۔

اس کے چہرے کی سرزمین پر زردی سی پڑگئی اور آنکھوں میں دو جزیرے سما گئے۔

آج......!

نجانے کیوں مجھے اس کی موجودگی سے ندامت ہورہی تھی۔ میرے قدم آگے بڑھ گئے۔ وہ میرا ارادہ بھانپ گئی اور مردنی سی آواز میں بولی۔

''بابو.جی...... مجھے افسوس ہے میری وجہ سے آپ......''

''ہونہہ''

''ہوسکے تو معاف کرنا''۔

''معاف؟''

''ہاں...... بابو.جی۔ میں نے آپ کو سمجھنے میں بڑی غلطی کی۔''

اس کا چہرہ غم سے اُداس ہوگیا اور آنکھیں پتھرا گئیں۔

میں اسے خاموش دیکھتا رہا۔ میرے ذہن کے کینوس پر خیالات ابھرتے اور ڈوبتے رہے۔

''مجھ پر دیا کیجیے۔ میں مجبور تھی ایسا کرنے کے لئے......''

اس کی آواز میں یاس وغم کی کپکپاہٹ تھی۔

''دیا کرنا میرے بس کی بات نہیں''میں نے جل کر کہا۔

نہیں!......ایسا مت کہیئے۔''

وہ دھوئیں کے ایک ورق کی طرح پھیل گئی۔

''میں نے آپ کے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔میں نے جھوٹی......''

وہ پھوٹ پڑی اور دیر تک ہچکیاں لیتی رہی ......لیکن میں صرف اسے افسردہ غمگین مجسمہ کی طرح دیکھتا رہا۔

''کیوں......کیا سوچ رہے ہیں آپ۔''

اس کی خوف میں ڈوبی ہوئی آواز سے میرے پیر من بھر کے ہو گئے۔

''کچھ نہیں......بس یونہی۔''میں نے بڑی مشکل سے جواب دیا اور اس غیر متوقع حالت پر سوچنے لگا۔

میرے سامنے ایک تاریک ہالا پھیلنے لگا اور میں اس ہالے میں ڈوبتا چلا گیا۔

میں خیالات سے دور ماضی کی عمیق گھاٹیوں میں بھٹکنے لگا......ایک ہفتہ......آج سے ایک ہفتہ پہلے......!

شام کو فضا کسی قدر بوجھل تھی اور سردی کی ہلکی ہلکی لہریں جسم میں کپکپی پیدا کر رہی تھیں ......چاند اب بھی ایک پتلی سی لکیر کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔

میں نہرو پارک کے ایک گوشے میں بیٹھا ہوا،سگریٹ کے لمبے لمبے کش لے کر اخبار کی سرخیاں پڑھ رہا تھا......اچانک میری نگاہیں ایک قیامت خیز پیکر پر مرکوز ہو گئیں جو میری طرف بڑھ رہی تھی......اخبار ہاتھ سے چھوٹ کہ میری گود میں آ گرا۔

میں اسے دیکھتا رہ گیا...... پریشان آوارہ زلفیں ، سیاہ غزالی آنکھیں اور چہرے پر معصومیت،ایک بجلی سی کوند گئی۔

''کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں۔'' اس نے آتے ہی مہر سکوت توڑا۔

''آں......ہاں کیوں نہیں بیٹھئے''۔

میں نے پاس ہی خالی نشست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سر ہلا دیا......وہ بے جھجک میرے قریب بیٹھ گئی......اس کی موجودگی سے گھبراہٹ اور خوف سے میرا دم گھٹنے لگا سارے بدن میں پسینہ کی چادریں پھوٹ پڑیں جیسے چونٹیاں رینگ رہی ہوں۔اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے جسم کا پارہ ایک دم سو سے اوپر چڑھ گیا ہو۔

میں چور نگاہوں سے اپنے ارد گرد دیکھنے لگا۔میں یہ دیکھ کر مطمئن ہوا کہ پارک میں سوائے چند آدمیوں کے کوئی بھی نہیں ہے......وہ بھی جیسے بھول بھلیوں میں کھوگئی تھیں۔

میں نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی......آخری کش لے کر سگریٹ کو بوٹ کی نوک سے مسل دیا اور اٹھنے کی کوشش کی۔

''دفعتاً اس نے خاموشی کا غلاف چاک کردیا۔

''نہیں......نہیں آپ شوق سے آرام کرلیجئے۔''......ایک مختصر سا جواب دے کر میں خاموش ہوگیا۔

''کیا کسی کا انتظار ہو رہا ہے؟''

''نہیں تو......'' میں نے بڑی مشکل سے جواب دیا۔

میں نے ڈرتے ڈرتے ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے اور پھر اس کی غزالی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔اس کے چہرے پر زندگی سے بھرپور مسکراہٹ تھی۔

''آپ کے چہرے پر ناگواری کے آثار دکھائی دے رہے ہیں۔''

''نہیں......ایسی بات ہرگز نہیں۔''

''کیا یہ تازہ پرچہ ہے'' وہ شاید خاموش نہیں رہنا چاہتی تھی۔

''ہاں......پڑھ لیجئے'' میں نے اخبار اس کی طرف بڑھایا۔

اس نے اخبار پر طائرانہ نگاہ دوڑائی میں اسے بغور دیکھتا رہا...... وہ سرشار تھی۔ اس کی چنچل طبیعت اور شوخی نے دل موہ لیا...... اور یہ سب کیا تھا میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا......

"یہ اخبار والے بھی کیا کیا لکھتے ہیں۔ کبھی ملازموں کی سڑائیک۔ کبھی بھوک ہڑتال اور کبھی.........." اس نے اخبار سے نظریں اٹھائیں اور میری طرف دیکھ کر کہنے لگی۔

"کیا آپ کو میری اس بات سے اتفاق ہے۔" اس کے ہونٹوں پر ایک شوخ مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔

"آپ درست ہیں لیکن اس کا کیا کیا جائے ابھی تو ہمارے ملک میں غربت ہے۔ لوگ فاقوں اور چیزوں کی بڑھتی ہوئی قیمتوں سے تنگ آگئے ہیں۔ ایسا ہونا تو قدرتی بات ہے۔"

"لیکن اس بھوک ہڑتال اور سڑائیک سے کیا ان کے مسئلے حل ہو سکتے ہیں۔" وہ چڑ کر بولی "نہیں۔ اس سے اقتصادی حالت اور متاثر ہو جائے گی۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں مجھے لگتا ہے یہ دشمن کے ایجنٹ ہیں جو ملک میں افراتفری پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"یہ بات نہیں۔ دراصل ملک میں ابھی غربت ہے۔ قیمتوں کا اتار چڑھاؤ ہے اور یہ ہڑتالیں اسوقت تک جاری رہیں گی جب تک نہ ان تمام مسئلوں کو حل اور بحران کو قابو میں کیا جائے۔"

"چھوڑیئے ان باتوں کو...... غربت۔ لاچاری۔ مفلسی...... اب تو غربت کا روگ وغیرہ سنتے سنتے کان پک گئے ہیں۔ میں یہ پوچھنا بھول ہی گئی کہ آپ نے اپنے متعلق......"

اس نے ایک دم موضوع کو ٹالنے کی کوشش کی۔

"کیسی عجیب لڑکی ہے۔" میں نے سوچا...... "خود مسئلہ کو الجھاتی ہے اور پھر اُگل دیتی ہے۔"

"کیوں صاحب! آپ پھر سوچنے لگے؟"

اس نے قیامت خیز انگڑائی لی اور اس کے سینے کا ابھار پہاڑی جیسا نمودار ہوا۔

میرے اندر کا مرد جاگ اٹھا۔ میرے بدن میں ایک ہولناک آگ سلگ اٹھی اور میں اس آگ میں جلتا رہا...... کچھ دیر پہلے کی گھبراہٹ ایک ہی پل میں دور ہوگئی اور میں نے اپنے دل میں اٹھتا ہوا طوفان اس کے سامنے اگل دیا۔

"ہاں...... ہاں۔ اپنے بارے میں کیا بتاؤں آپ ہی کہئے نا۔"

"میں آپ کے بارے میں...... میرے پاس کوئی جادو کی چھڑی نہیں کہ میں آپ کے متعلق کچھ کہوں۔ ہاں اتنا کہوں گی کہ آپ اپنے دل میں اٹھتے ہوئے طوفان کا اظہار کرنے سے ہچکچاتے ہو اور ... لیکن میں اپنے متعلق اتنا ہی عرض کرتی ہوں......"

وہ جملہ ادھورا چھوڑ گئی اور زور زور سے ہنسنے لگی۔

"میں مدراس سے اپنی کالج سہیلیوں کے ساتھ یہاں آئی ہوں...... ویسے ڈیڈی کا خیال تھا کہ پریوار سمیت اس بار شملہ جائیں گے لیکن میں.........."

"اور آپ یہاں آئیں"۔

"بالکل درست۔"

میں کسی گہری سوچ میں پڑ گیا۔

"اور کیا بتاؤں...... دن بھر ان کی خرافات نے مغز چاٹ لیا۔ اب ان سے بھاگ کر یہاں آئی تا کہ......"

"چند منٹ تپسیا کے لئے......" میں نے اسے لقمہ دیا اور اس کے ساتھ ہی ایک کھوکھلا قہقہہ فضا میں اچھال دیا۔ وہ بھی بے تحاشا قہقہے لگانے لگی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے قہقہوں میں زندگی کا سنگیت ہے۔"

"بہت خوب۔ آپ نے فقرہ چست بنا دیا۔"

"شکریہ!"

"یوں ہی بیٹھنا اچھا نہیں ...... دیکھئے نا۔ چاند کا حسن وشباب بھی جوبن پر ہے۔ آؤ اس پہاڑی تک چلیں اور زندگی کے چند لمحات خوشی میں کاٹیں۔"

"نہیں ...... پھر کسی دن"۔

"کوئی بات نہیں ...... میرے خیال میں سنیچر کا دن اچھا رہے گا۔"

یہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی ......

وہ پارک سے چلی گئی اور اپنے ساتھ بھینی بھینی خوشبو بھی لے گئی اور مجھے شدت سے تنہائی محسوس ہونے لگی۔ میری نگاہیں حد نظر تک اس کا تعاقب کرتی رہیں اور وہ ٹیکسی میں سوار ہو کر جیسے تاریکی میں ڈوب گئی۔

اور سنیچر کے روز ......!

اچانک مجھے علی الصبح بیلواڈ پر واقع ایک شناسا دوکاندار کے پاس جانے کا اتفاق ہوا۔

ٹیکسی سے اترتے ہی میری حریص نگاہیں پارک کے اسی گوشے کی طرف مرکوز ہو گئیں۔ جہاں مجھے حسب وعدہ اس سے ملنا تھا!

میں نے رسٹ واچ کی طرف دیکھا۔ !ایک ہفتہ کیسے گزرا۔ مجھے اس بات کا پتہ ہی نہ چل سکا۔ اس دوران میں دفتری کاموں میں بُری طرح الجھ کرہ گیا تھا ۔ کہتے ہیں نا۔

ہیں اور بھی غم زمانے میں محبت کے سوا

اس عرصہ میں اُسے تقریباً بھول چکا تھا۔

"اوہو ...... ابھی پورے آٹھ گھنٹے ہیں۔" میں تلملا اٹھا۔

گردوپیش پر طائرانہ نگاہ ڈال کر میں آگے بڑھا۔

"صاحب ! آپ کو بھگوان سلامت رکھے ۔ میں مصیبت زدہ ہوں ۔ میری کچھ مدد کیجئے۔"

میں ان سنی کر کے آگے بڑھا۔

"بھگوان کے لئے ایک روپیہ دیجئے۔ دودن سے بھوکی ہوں۔"

اس آواز پر میرے قدم جم گئے۔ پلٹ کر دیکھا تو پیروں تلے کی زمین کھسک گئی۔ پل بھر میں نے سوچا کہ یہ شاید کوئی نیم پاگل بھکارن ہے۔

اس کے سر کے بال الجھے ہوئے تھے۔ کپڑے تار تار اور پاؤں چھلنی ہو چکے تھے۔ اس کا سپید اور ملائم گوشت چیتھڑوں میں صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کانسی کا کٹورا تھا۔ جس میں چند سکے میری احمقانہ حرکت پر مضحکہ اڑا رہے تھے۔

"بابو جی!......آپ؟"

اس کے منہ سے خوف میں ڈوبی ہوئی آواز نکلی اور میرے وجود پر برق سی گر پڑی!

مجھے پل بھر کے لئے ساری دنیا گھومتی ہوئی نظر آئی۔ میں سوچنے لگا کہ عورت اپنی ذات کو چھپانے کے لئے کتنا جھوٹ بولتی ہے۔ حقیقت پر کتنے پردے ڈالتی ہے اور احساس کمتری کا شکار ہو کر کیا کیا خواب اور سپنے دیکھنے کی آرزومند ہوتی ہے......لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہ باتیں کسی حد تک میری ذات سے ہی تعلق رکھتی ہیں۔

میں اسے کچھ اور کہے بغیر ہی ریسٹورنٹ کی طرف بڑھ گیا......!!!

پگلا کہیں کا......

نوریؔ کی خوشی دیدنی تھی......!

کوئی اُسے پوچھ لیتا تو اس کی دل آویز مسکان اور میٹھی میٹھی آواز کانوں کو اور سارے ماحول کو شگفتہ کرتی ہوئی دل میں اتر جاتی۔

اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا اس لئے کہ آج اس کا خواب پورا ہونے جا رہا تھا۔ نور چشم اب پانچ سال کا ہو گیا تھا۔ دو بہنوں میں وہ اکلوتا بھائی تھا۔

نزدیکی بستی کے اسکول میں داخلہ دلوایا گیا۔ برادری اور ہمسائیوں میں برفی اور مٹھائی بانٹی گئی۔ محتاجوں، مسکینوں اور فقیروں میں خیرات تقسیم کی گئی۔

انگلی پکڑ کر آجکل وہ نور چشم کو اپنے باپ کے ساتھ دُور تک جاتے ہوئے تکتی رہتی اور خوشی سے پھولے نہ سماتی۔ اس نے خوبصورت شکل وصورت پائی تھی۔ ساتھ ساتھ فہم و فراست بھی بدرجہ اتم تھی۔ وقت پر لگا کر اڑتا رہا۔ سب کچھ بہت اچھا جا رہا تھا۔

نور چشم نے آٹھویں جماعت میں اچھے نمبرات سے کامیابی حاصل کی تو اُسے وہاں سے رخصت ہونا پڑا۔

نوری کے ارادے بہت بلند تھے۔

وہ بیٹے کو پڑھا لکھا کر کسی قابل بنا دینا چاہتی تھی۔ بستی میں آگے پڑھائی کا معقول انتظام نہیں تھا۔ اب وہ اپنے گھر اور بستی سے دور شہر کے ہائی اسکول میں جایا کرتا تھا۔ اکیلا ہی پے اینگ گیسٹ Paying guest کی حیثیت سے رہ رہا تھا۔ سارا خرچہ نوریؔ

چرخہ کات کات کر پورا کر دیتی۔ اور بیٹا بھی جی لگا کر خوب پڑھتا۔

اب اُسے سال کے بڑے بڑے تہواروں کی چھٹیاں گذارنے کے سوائے بستی میں رہنا پسند نہیں آتا تھا۔ ابھی آیا نہیں کہ انگلی کی پوروں پر گن گن کر دن بڑی مشکل سے کاٹنے پڑتے۔ یہاں رہ کر اب اُسے اجنبیت سی محسوس ہوتی۔ نئی دنیا میں جو آ گیا تھا۔

ہر چند پہلے پہل شہر آ کر اس نے بڑے پاپڑ بیلے۔ گھٹن کے ماحول میں گندے الفاظ اور فقرے سنتے سنتے دل برداشتہ ہو کر اس کا ذہن ماوف ہوتا رہا۔ یہاں رہنا اب برداشت سے باہر ہو گیا تھا۔ مایوس واپس لوٹ آتا۔ ماں کا خیال کرتے کرتے پاؤں میں بیڑیاں محسوس کر لیتا۔ اُسے ناخوش دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔

بھاری من کے ساتھ نئی پہچان نئی قرابت حاصل کرتے کرتے اپنی سوچ کو بدلنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔

وقت گزرتا رہا۔

شہر کی چکا چوند خوبصورتی، بھول بھلیوں سا ماحول اور نئے نئے چہروں کو دیکھتے ہوئے بکرے کی ماں آخر کب تک خیر مناتی۔ ایک نئے ماحول نے آ گھیرا۔ اُسے اس کا مطلق احساس ہی نہیں ہوا کہ کب اور کیسے اس کی دنیا بدل گئی۔

اسکول شہر کے مین بازار سے قدرے قریب پڑتا تھا۔ اس ناطے لڑکے شہر آسانی سے آتے جاتے رہتے۔ من پسند چیزیں خرید لیتے۔ لذیذ ذائقوں کا بھی لطف اٹھاتے۔ اس طرح جب جی چاہیئے ادھر ادھر چہل پہل کر سکتے تھے۔ لیکن آوارہ گردی سے کیا کیا تماشا دکھاتی ہے یہ آگے چل کر تب معلوم پڑتا ہے جب آدمی کسی دلدل میں پھنس کر سنبھل نہیں پاتا ہے۔

پھر ایک دن بات ایسی ہوئی۔ شہر میں چاروں طرف ہاہا کار مچ گئی۔ اچانک شہر کے گنجان علاقوں سے سلسلہ وار پانچ سات خطرناک دھماکوں کی گونج سنائی دی۔ اس بات

نے سبھوں کو حیرت میں مبتلا کر دیا...... یک لخت اس نے شہری زندگی تہس نہس کر دی۔ اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے۔ ایسا منظر پہلی بار دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ شہر...... شہر نہ رہا۔ دھوئیں سے اٹا چند گھنٹوں میں ملبے کا ڈھیر بن گیا۔ گویا یہ بازار کبھی آباد نہ تھا۔ کئی جانیں تلف ہوئیں۔ قیامت ٹوٹ پڑی۔ جابجا انسانی خون کے دھبے بکھری ہوئی ٹوٹی پھوٹی چیزوں کو روندتے دہشت زدہ لوگ محفوظ جگہوں کی طرف بھاگنے لگے۔ نئی نئی افواہیں جنم لیتی رہیں۔

دوسرے دن میڈیا اور اخباروں میں جلی حروف میں سرخی آئی۔ سرحد کیا اُس پار سے دہشت گرد گروپ شہر میں گھس آیا ہے۔ یہ سب کچھ اسی کی کارستانی ہے۔

کئی دنوں تک مجوزہ ہڑتال سے تناؤ و کشیدگی بدستور بڑھتی رہی۔ سارا نظام جیسے ٹھپ ہو کر رہ گیا۔ اسکولوں اور کالجوں کے دروازوں پر آہنی تالے پڑ گئے۔ لوگ سڑکوں پر جلسے جلوس اور نعرہ بازی پر اتر آئے۔ حفاظتی دستے کافی چوکس اور مستعد دکھائی دیئے۔ کہیں گڑبڑ کرنے کی کوشش کی گئی تو لاٹھی چارج ورنہ گولیوں سے بہت سی قیمتی جانیں ضائع ہو جاتیں۔

مختلف تنظیموں کی طرف سے احتجاجی مظاہرے ہوئے۔ ان ریلیوں کا آنسو گیس لاٹھیوں اور گولیوں سے استقبال کیا جاتا۔ پکڑ دھکڑ میں جو بھی آجاتا تو شدید مار پیٹ کے بعد حوالات کے اندر دھکیلا جاتا۔

اس بار سب سے بڑا حملہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل پر ہوا۔ حملے کے بعد ایک بڑی تعداد حراست میں لی گئی۔ مشکوک افراد کے خطرناک ارادے اور منصوبہ بندی کے بارے میں طرح طرح کے بیانات جاری کر دیئے گئے۔ حالات کافی سنگین نظر آرہے تھے۔

شاید قدرت کو یہی منظور تھا۔

جلسے جلوس ہڑتالی کالوں کا جنون تھما نہیں۔ کرفیو سے زندگی اجیرن بنی جذبات

بھڑک اٹھے۔ سارا ماحول مشتعل ہوا۔ کوئی سمجھوتہ تکمیل نہیں پا رہا تھا۔

نوریؔ کی آنکھیں آبدیدہ تھیں۔

روز روز کی تشویشناک ہلاکتوں کی خبریں سنتے سنتے اس کی روح دو حصوں میں بٹ کر رہ گئی تھی۔ ایک حصہ بستی میں چھوڑ آتی دوسرا حصہ لیکر شہر کی گلیوں میں بیٹے کو ڈھونڈا کرتی۔

اس کا دل و دماغ ایسے خیالات کا آماجگاہ بنا۔ ایک ایسا نیا جنگل بن گیا جہاں ہر سو تاریکی ہی تاریکی تھی اور خطرناک و موذی جانوروں کی آبادی تھی۔

نور چشم بھی اب عمر کے ایک نئے موڑ پر کھڑا ہوا تھا۔ خودسر اور آوارہ ہو گیا تھا۔

نوری سوچتی رہتی۔ اس کی پرورش میں کہاں بھول ہو گئی تھی۔ جسکی پاداش میں وہ یہ سزا بھگت رہی ہے۔

آج ایک بار پھر شہر میں گولی چلنے کی خبر آئی۔

عین موقع پر دو نوجوان سمیت ایک اڈھیر عورت بھی ہلاک ہوئی۔ ابھی تک لاشوں کی شناخت نہ ہو سکی تھی۔ لوگوں کا ایک جم غفیر اُمڈ آیا اور دوبارہ کرفیو نافذ کرنا پڑا۔

نوریؔ گھر کے باہر صحن میں آجکل چنار کے درخت کے نیچے انتظار کرتی رہتی تھی۔ اُسے پورا یقین تھا۔ اس کا پگلا کہیں کا ضرور ملنے چلا آئے گا۔

اس بہانہ اس کی راہ تکتی ہوئی اپنے مقدر کو کوستی رہتی۔ اُسے اس بات کا پتہ دیر سے لگا کہ اُسے شہری زندگی راس نہ آئی تھی۔ وہ تیز آندھی میں کاغذ کا کوئی ٹکڑا اڑا اڑا الگ رہا تھا۔ اس کے مزاج میں چڑچڑاپن اور سوچ پر میلی گندی پرت چڑھی بات بات پر کھانے کو دوڑتا تھا۔ چوری چکاری، جوئے اور گانجہ پینے کی لت پڑی۔ اُسے اسکول سے باہر پھینک دیا گیا اب اُسکی قسمت میں صرف دوڑنا بھاگنا لکھا تھا۔

کئی ہفتوں سے رو رو کر نوریؔ نے خود کو بالکل نڈھال اور پسپا کر دیا تھا۔ رہ رہ

کر بیٹے کی جدائی پر گھر کی چھتیں آسمان سے جالگتیں اور دیواریں زمین بوس محسوس ہوتیں۔ عجیب احساس نے گھیر رکھا تھا۔

پچھلے دو تین دنوں سے بستر پر لیٹی لیٹی خود کو سنبھال نہ پا رہی تھی۔ اب اس کی آخری تمنا تھی کہ وہ اپنے بیٹے کو ایک بار گھر آتے دیکھتی۔ پھر جی بھر دیکھ لیتی۔ گلے سے لگا لیتی۔ ہونٹوں پر کوئی حرف شکایت نہ لاتی۔ بے بس ہو کر اس نے آسمان کی طرف نگاہ کی۔" یارب! تو بے نیاز ہے سب کا حال جاننے والا ہے۔"

کرفیو میں ڈھیل دی گئی تھی۔

لوگ جوق در جوق گھروں سے نکل پڑے۔ خانہ اموری کی چیزوں کی خریداری کے مول بھاؤ میں مصروف ہو گئے۔ اس دوران بازار میں کافی گہما گہمی اور ہلچل تھی۔ جو رکے پڑے تھے۔ اپنے اپنے گھر کی جانب لوٹ آئے۔

جانے آج کیا سوچ کر اس نے اپنی بستی میں جانے کا تہیہ کر لیا۔ یا ماں کی دعاؤں کے اثر نے اُسے کھینچ لایا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے راستوں کو عبور کرتے ہوئے شیطان کی آنت کی طرح لمبی بائی پاس سڑک پر آ گیا۔ یہاں سے اس کی بستی تک اب چند کوس کا فاصلہ رہ گیا تھا۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتا رہا۔ پیچھے پیچھے ایک دیہاتی عورت اپنے سات سالہ بچے کے ہمراہ چلی آ رہی تھی۔ کافی گھبرائی، نڈھال اور شکستہ اور بھاری قدموں سے بڑھتی ہوئی خوف نے اس کے حواس گم کر دیئے تھے۔ راستہ میں نجانے کیا کیا بڑبڑاتی ہوئی بچے کو ڈانٹ سنا رہی تھی۔

کچھ ہڑتالی لوگوں نے اینٹوں اور پتھروں سے بیچ راہ سڑک پر دیوار کھڑی کر دی تھی ناقابل سفر بنا دیا تھا تاکہ کوئی ہلکی گاڑی آر پار کرنے سے قاصر رہے۔

سامنے سڑک پر آناً فاناً ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا جو اشتعال انگیز نعرے لگا رہا تھا۔ وہ گھبرا

اٹھا۔ گھر جانے کا متبادل راستہ ڈھونڈ نہ پایا اور بُری طرح ان کے نرغے میں پھنس کر تذبذب کا شکار ہو گیا۔

جانے کونسی قوت عود کر اس کے بدن میں سرایت کر گئی۔ تھوڑی دور تک جلسوں کے ساتھ سب سے آگے شعلہ جگاتا رہا۔

"ہماری مانگیں پوری کرو......" لوگ اپنے حقوق کے لئے سراپا احتجاج تھے۔

"تاناشاہی نہیں چلے گی۔"

دفعتاً پچھّم سے ایک ایسی آندھی آئی اور چلی گئی کہ ہر سامنے والی چیز کو اڑا کر لے گئی۔ درین اثناء کہیں سے گشتی پولیس پارٹی نمودار ہو گئی۔ اچانک سامنے آس پاس کے لوگ اس قدر مشتعل ہوئے۔ غصہ سے بھرے پتھراؤ کرنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں ٹیئر گیس پھینکے گئے۔

اس کے چہرے کا رنگ اڑ چکا تھا۔ سانسوں کا زیر و بم منتشر ہو گیا۔ وہ بت بنا کھڑا دیکھتا رہا۔ بھاگ نہ سکا۔ دور دور تک اُسے موت رقص کرتی ہوئی دکھائی دی۔ اُسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ انجان عورت جو فٹ پاتھ پر کھڑی تھی کہیں دکھائی نہیں پڑی۔

پھر نہ جانے وہ کیسے اکیلا رہ گیا۔ اُسے اتنا ہی یاد رہا۔ کسی نے بندوق کا دستہ پوری قوت سے اس کے سر پر دے مارا۔ دوسرے نے ڈنڈے کی نوک اس کے سینے میں چھبو دی۔ دیکھتے دیکھتے لاتوں، گھونسوں سے پیٹنا شروع کر دیا۔ دور سے کوئی افسر غلیظ گالیاں بکتے ہوئے اپنے ساتھیوں کا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔

وہ چیختا چلاتا رہا۔ لیکن اس کی آواز صدا بہ صحرا ہوتی رہی۔ اس کے سر سے خون کا فوارہ اُبل پڑا۔ وہ دیر تک کراہتا رہا۔ سسکتا رہا۔ اب اس کی طاقت جواب دے چکی تھی آخری لات منہ پر لگی نیچے گر اپڑا۔ دیکھتے ہی کسی اندھیرے غار میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اسے پولیس کسی مردے جانور کی طرح گھسیٹ کر لے گئی۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو آنکھوں کو مل کر یونہی نظریں پھیلائیں اسوقت سلاخ لگے روشن دان سے روشنی باہر جھانک رہی تھی۔ تنگ کوٹھری کی چاردیواری کے اندر کرنیں داخل ہوکر بوجھل ماحول سے گھس پیٹھ کرنے میں مشغول تھیں۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

زخموں سے چور اس کا سارا بدن درد سے کراہ اٹھا۔ چاہ کر بھی آواز اسکے حلق سے باہر نہیں نکلی۔ خوف نے پورے حواس کو جکڑ لیا تھا۔

ہاتھ پاؤں شل ہو چکے وہ فرش پر گر پڑا تھا۔ اٹھ نہیں پا رہا تھا۔

وہ نوری کو یاد کر کے آبدیدہ ہو گیا۔

دفعتاً اسکی نظریں دروازہ کی جانب اٹھیں۔ اسے پاؤں تلے زمین شق ہوتی محسوس ہوئی۔ باہر بجھی نظروں سے گھورتی ہوئی وہ دم سادھے کھڑی تھی۔ اسکے چہرے پر ایک اداسی آتی اور چلی جاتی کوئی فیصلہ کر نہیں پا رہی تھی۔

کمرے کی فضا غیر مانوس تھی۔

نوری دیر تک روتی رہی۔ ایک آندھی سی تھی جو اسکے اندر چل رہی تھی۔ ممتا کے چہرے پر طمانیت وشفقت کی کوئی کشش یا پھٹکار برس رہی تھی۔ پل بھر کے لئے اس کی حالت پر ترس آرہا تھا اور بے تحاشہ غصہ بھی آرہا تھا۔

ان حالات کی وہ خود کو ذمہ دار سمجھ رہی تھی۔ شاید پالنے پوسنے میں کوئی کمی رہ گئی تھی۔

اس کے خواب ایک ایک کر کے ایسے چور چور ہوئے کہ سمیٹ نہ سکی۔

اب اسکے پاس سوائے ندامت کے کچھ بھی بچا نہ تھا۔!!!

..............☆☆☆..............

گمشدگی

کتنے ہی برس گذر گئے۔

اس بات کا اندازہ اسوقت ہوا جب اچانک ایک تیز ہوا کا جھونکا دکھتی رگ پر انگلی داب کر چلا گیا۔ عمر کے آخری پڑاؤ پر یاداشت میں کمزوری بہرحال آجاتی ہے لیکن یہ الگ بات ہے کہ اس واقعہ کے کچھ انمٹ نقوش ابھی بھی ذہن کے کینواس پر تروتازہ لگ رہے ہیں۔

سٹور روم Store room کی صفائی ہو رہی تھی۔ چیزیں بے ترتیبی سے فرش پر بکھری پڑی تھیں۔ الماری کے پٹ کھل جاتے تو میں بھونچکا سارہ جاتا۔ سامنے کا منظر دیکھتے ہی اپنے وجود کو ایک چھوٹی سی گٹھری میں سمٹا پاتا ہوں۔ میں اندر ہی اندر ٹوٹنے لگا۔ اس پر کئی برس سے اتنی دھول اور مٹی جمی تھی جیسے ابھی ابھی وہ منوں مٹی سے گرد جھاڑتی ہوئی باہر نکل آئی ہو، کانپتے ہاتھ دھول مٹی صاف کرنے میں جٹ جاتے ہیں۔ پھر بڑی احتیاط سے خوش ہو کر فرش پر نوزائیدہ بچے کی طرح اُسے رکھ دیتا ہوں۔

میں ماضی کی یادوں سے دُور بھاگنا چاہتا تھا لیکن اضطرابی کیفیت رگ رگ میں دوڑ جاتی ہے سکتے کے عالم میں خاموشی سے دیوار کے پاس ٹیک لگا کر بیٹھ جاتا ہوں۔ کشش اس قدر تھی کہ گٹھری کھولنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔

ہوا کا ایک تیز ریلا آتے ہی سارے اخبار اور رسالے فرش پر بکھر جاتے ہیں۔ سمیٹنے کی کوشش کرتے ہوئے ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے کئی رسالوں کا کاغذ بالکل پیلا ہو کر سڑ گیا ہے۔ کئی ان میں سے دیمک چاٹنے سے چیچک زدہ منہ بسورتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے چھوٹے چھوٹے کاغذ کے پرزے ایک ایک کر کے ہوا میں اڑ کر سارے فرش پر پھیل گئے تھے۔

کس قدر ٹھیس میرے دل کو لگی اور کلیجہ پھٹنے کو آرہا ساتھ ہی مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے عمر کے آخری پڑاؤ میں اکھڑی اکھڑی سانسوں کے ٹوٹنے اور آنکھوں کی بصارت کم ہونے کے سبب اس قدر میرا حال پرانے کاغذ جیسا ہورہا ہو۔

دیر تک میں بغور دیکھتا رہا۔ جوں جوں اخباروں اور رسالوں کو پلٹتا رہا۔ توں توں ذہن کے پرانے اور شکستہ کینوس پر ماضی کے دھندلے نشانات اُبھرنے لگے۔ میں اپنے ذہن کو کریدتا رہا۔ کریدتا رہا۔ کچھ پرانی بسری یادیں، شاید میری کسمپرسی حال پر ترس کھا کر یادوں کے دریچے کے کواڑ کھلتے ہوئے محسوس ہوئیں۔ میں انہیں یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

ایک دن جب وہ اچانک اس طرح روپوش ہوا۔ کہ مدت تک کوئی خبر معلوم نہ ہوئی۔ بسیار تلاش کیا لیکن بے سود۔ آخر مایوسی کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنا ڈھیر ہو کر رہ گیا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ جدائی کے لمحات کس قدر اذیت ناک ہوتے ہیں۔ گویا جسم سے کوئی حصہ الگ کر دیا گیا ہو، اس عرصہ میں کتنے جانے پہچانے اور پرانی صورتیں زمین میں دب گئیں جن میں سے ایک ایک کو گننا کافی مشکل تھا۔

ہم دونوں ایک عجیب بندھن اور ایک ناطہ سے جڑے تھے گویا ایک ہی ناؤ میں سوار......

اس کی غیر متوقع گمشدگی سے اچانک دیوار میں جیسے دراڑ سی آگئی پھر خود بخود ایک ایک کر کے اینٹیں باہر نکل آئیں۔ رفتہ رفتہ کئی چھوٹے بڑے شگاف پڑتے ہی کئی آسیب زدہ پرانے کھنڈر میں اسے بدل جانے میں زیادہ دیر نہ لگی۔

اسکی واضح صورت رنگ وروپ اور لہجہ میری آنکھوں میں سما گیا جسکی یاد آتے ہی گویا وہ میرے سامنے کھڑا ہوتا۔ گھڑی کی دو سوئیوں کی طرح ہماری سوچ میں کافی یگانگت تھی۔

ایک مدت تک ادبی حلقوں سے بھی اس قدر وابستگی رہی اور ہر مجلس میں فخر سے جانا فرض کی ادائیگی تصور کیا جاتا۔ ہماری کوشش شانہ بشانہ اپنی الگ الگ کہانیاں لکھنے کا جنون

جیسے سر پر سوار ہو گیا تھا۔

چاہت بڑھتی گئی۔ منزلیں طے ہونے لگیں گویا دونوں کی محبوبہ ہو بہو ایک جیسی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ الفاظ کے پیرہن میں ابھی وہ مجھ سے سبقت لے جاتا تھا۔ اور کبھی میں دو گز آگے جاتا۔ اس نے اپنی چھوٹی سی دنیا میں اپنی انفرادی حیثیت بنائی۔ جسے ہر کوئی نذیر شہناز کے نام سے جاننے لگا۔ میں بھی اپنی ساکھ بنانے میں محتاط رہتا۔ کہانیاں، رسالوں اور اخبارات میں چھپتی رہیں دیر تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔

دیکھتے ہی دیکھتے اچانک گرد و پیش میں ایسی ہولناک آندھی چلی کہ زندگی کی تمام رعنائی مرجھا گئی۔ یکلخت سینکڑوں قدیلیں بجھ گئیں۔ نسل کشی اور قتل غارت کا بازار گرم ہو گیا۔ بزرگوں کو زلیل کیا جاتا رہا اور چھوٹوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح جیلوں میں ڈال دیا گیا۔

خیالات اور جذبات کا اظہار کرنے کا ایک سیلاب امڈ پڑا۔ گویا کئی برسوں سے چھپا ہوا لاوا ابل پڑا ہو۔ قلم بے تحاشہ چلتا رہا۔ لیکن اسکی روشنائی لہو میں بھگوئی ہوئی چار سو قبرستان کے کتبوں پر آہ و فغان کی داستان تحریر کرتی رہی۔ ساری محفلیں جہلم کے بہاؤ میں بہہ کر ماتم کنان ہوئیں۔

اسکے اس طرح بچھڑنے سے مجھے اپنے وجود میں کھوکھلے پن کا احساس ہونے لگا۔ جیسے میرے اندر کچھ ٹوٹ گیا ہو۔ ڈھونڈنے کی تمام کوششیں رائیگان ثابت ہوئیں۔ تب مجھے اکیلا پن ہونے کا احساس ستانے لگا۔ میں خوف زدہ ہوا۔ بھاگ نہیں پاتا تھا۔ جیسے ریگ زار میں تنہا سپاہی خستہ حال ہو کر رہ گیا ہو۔ لکھنے میں بدمزاجی زور پکڑتی گئی جیسے میرے شوق پر کسی نے شب خون مارا ہو۔ خیالات اور جذبات کا طوفان آہستہ آہستہ تھم گیا۔ قلم کی روشنائی کچھ مٹتے مٹتے نشان چھوڑتے ہوئے محسوس ہونے لگی میں کچھ آگے لکھنے سے قاصر رہا۔

کئی بار سوچا۔ آخر سوچ کی آخری دہلیز پر اس بات کا فیصلہ کر ہی لیا۔ تمام اخباروں اور رسالوں کو ایک کپڑے میں باندھ کر ایک اچھی سی گٹھری کی صورت میں بدل ڈالا۔ جس میں

میری کہانیاں چھپ چکی تھیں۔ سٹور روم کے ایک پرانی الماری میں منتقل کردی۔ اطمینان کا سانس لیا گویا کسی مردے کو لحد میں اتار دیا ہو۔

اب میں سب کچھ بھول جانا چاہتا تھا...... ایسا ہی ہوا۔ اس طرح کئی دہائیاں گذر گئیں۔ کئی یگ گذر گئے۔ اس دوران لکھنے کا کاروان بھی سمٹ کر رہ گیا۔ آدھی سے زیادہ عمر پار کر چکا تھا۔ کہ اب اچانک پرانے اخباروں اور رسالوں کو ٹٹول رہا تھا۔ کتنی ذہنی کوفت اٹھانی پڑی کہ بار بار عینک میں چھپی آنکھوں سے کھارے پانی کی آمیزش اُترتی محسوس ہوئی۔ شاید وہ اس روگ کو اتر آنے پر للچائے نظر آرہی تھیں۔ لیکن تکلیف کی صعوبتیں برداشت کرنے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔

بار بار مجھے جوانی کے دنوں کا احساس کچھ کچھ ہونے لگتا۔ ذہن کے دریچوں سے بیتے دنوں کے واقعات دھیرے دھیرے اُمڈ آرہے تھے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے۔ جب کہ میرے بالوں میں سیاہی اور چہرے کی سپاٹ گندمی رنگت اور آنکھوں میں تیز بصارت قابل رشک تھی۔ تبھی ہم دونوں اپنے اپنے گھروں میں رات گئے تک چاندنی کی ملگجی روشنی میں قلم و کاغذ، سنبھالتے ہوئے ان گنت الفاظ جوڑتے...... پھر کسی سنسان پارک کے گوشے میں بیٹھ کر کہانیوں کی نقاب کشی ہوجاتی...... دیر تک بحث ومباحثہ کا دور چلتا رہتا...... نجانے کتنی کہانیاں جنم لے چکی ہیں...... بغیر کسی اڑچن کوئی اخلاف کسی تضحیک کی کوئی گنجائش حائل نہ ہوجاتی۔

بے ٹوک تبصرہ ہوتا رہتا...... ایک کامیاب آرٹسٹ کی طرح نئے نئے رنگ بھر دیتے۔ لفظوں کے زیورات سے آراستہ ایک سجی سجائی دلہن کی طرح ہماری کہانیاں معروف رسائل میں چھپ جاتیں۔ اچانک اس تگ ودو میں جانے وہ کہاں کھو گیا......؟

میرے سامنے اخباروں اور رسالوں کا ڈھیر پڑا ہے اور مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں خود اپنے لفظوں کی صلیب پر کھڑا ہوں۔!!! ....☆☆☆...............

کوکھ کا زہر

وہ اس بات پر اعتبار کیا کرتی یا اس کا اندھ وشواش تھا۔

وہ اکثر کہا کرتی۔ بڑے بزرگوں کا کہنا ہے۔

کہ جب بائیں آنکھ پھڑ پھڑائے یا کبھی کوئی بلبل اڑتا ہوا کھڑکی کے پٹ پر آ کر بیٹھے اور اپنی مدھ بھری تان میں کوئی نغمہ چھیڑ دے تو اس بات کا پتہ لگتا ہے کہ دیر سویر کوئی مہمان آنے والا ہے۔

چنانچہ اس نے دونوں کھڑکی کے پٹ وا کر دیئے۔

سہ پہر تک وہاں لوگوں کا تانتا بندھا رہا۔ کہیں کسی طرح کے مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ سناٹا چھانے لگا۔

اب وہ اکیلی رہ گئی تھی۔ خیالات کی اڑن طشتری پر سوار نجانے کیا سوچ رہی تھی۔

نرسنگ ہوم کے کمرے میں بیٹھی بیٹھی پچھلے پہر سے اب تک اونگھتے ہوئے اُسے بوریت سی محسوس ہو رہی تھی۔ بیڈ کے قریب رنگین اور خوبصورت پالنا تھا۔ دیکھتے دیکھتے وہ ہر ایک کا دل موہ لیتا تھا۔ اور ان کی آنکھوں کا تارا بنتا۔ خوابوں کا شش محل یا ماضی کے درد بھرے ساز ......!

اُسے پا کر ایک نئے ساتھی کی رفاقت حاصل ہوئی۔ جسے وہ کئی مہنیوں سے اپنی کوکھ میں چھپا کر اُمید کی موہوم جھلک لئے انتظار میں لگی رہتی۔

کھڑکیوں سے جھانکتی کرنیں تھک کر دبے پاؤں واپس لوٹنے کیلئے پر تول رہی تھیں ۔ وہ اپنا سر ٹانگوں میں دبائے بیٹھی سوچنے لگی۔ وقت پر کوئی اعتبار نہیں وہ ہوا کا رخ بدلنے کا

کوئی بھی اندازہ نہ کر سکی۔ اس سے پہلے ان کی نظروں میں اسکی قیمت کوڑی کے برابر تھی اُسے پاتے ہی وہ خود کو ہاتھی کی مانند سوالاکھ کا سمجھنے لگی۔ قدرت کا یہ نادر تحفہ کتنا بے نظیر اور لاجواب تھا۔ اس کے آنے پر سارا ماحول خوشگوار ہو گیا اور اس کی زندگی میں ٹھہراؤ سا آ گیا۔ اس کے چہرے اور درودیوار سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔

ایک ہفتہ پلک جھپکتے ہی گزرا......!

یہ وقفہ وہ اپنے سگے اور جانے پہچانے لوگوں کی لمبی لمبی حیات بخش دعائیں سمیٹنے میں مشغول تھی۔ ہر چند رہ کر اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھ رہی تھی۔ ایک مسلسل تلاش اور تجسس کی کروٹیں لیتی ہوئی اس کی آنکھیں دروازے پر جا لگتیں اور انتظار کرتی رہتیں۔ مگر نارسائی کا دکھ اس کے دل کو کچوکے لگا رہا تھا۔ اُسے یاد کرتے کرتے آبدیدہ ہو جاتی۔ وہ مرجھائے گلاب کے پھول جیسی ہو کر رہ گئی تھی۔

وہ اکثر سوچتی رہتی۔ اپنے ملول دل کو تشفی دیتی رہتی۔ ہو سکتا ہے وہ حقیقت سے بے خبر ہو یا اس کے بارے میں کچھ بھی نہ جان سکا ہو۔ وہ پنکھ لگا کر اڑتی اڑتی اُسے سب ماجرا سنا دیتی۔ کوئی نامہ اس کے نام لکھ دیتی۔ لیکن وہ ایسا کر نہ سکی۔ کمرے کی چار دیواری اُسے ایسا کرنے سے روک رہی تھی پر کٹے پرندہ کی طرح اس کی اڑان بے معنی ہو کر رہ گئی۔ اتنا سنگدل نہیں تھا وہ......اپنی چاہت میں خوشگوار صبح کی پہلی کرن دیکھنے کو ننگے پیروں نا سہی لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا آتا۔ دیر آید درست آید کمرے کی تنہائی کے سوا کوئی اور تیسرا وہاں موجود نہ تھا......!

کھڑکی سے جھانکتی کرنوں نے تھک کر اب کمرے میں گھسنا چھوڑا تھا۔ بوڑھا سورج کب کا مغرب کی بانہوں میں اتر گیا تھا۔ شام کے سرمئی آنچل نے ہر چیز کو اداسی میں لپیٹ لیا تھا۔ خاموش تنہائی نے سارے ماحول پر اپنا جادو کر ڈالا تھا کہ اب کسی مرگھٹ کی طرح ویران سا لگ رہا تھا۔

جانے وہ کب تک بے سدھ بیٹھی رہی اور دیر تک خاموشی میں تیرتی رہی۔ پریشان اور

ایک اداس پیکر کی طرح جیسے کوئی ٹوٹی ہوئی مورتی مندر سے باہر پھینک دی گئی ہو۔

کمرے کی فضا غیر مانوس تھی ہر شے سے وحشت سی برس رہی تھی۔

اس کی متلاشی نظریں بدستور دروازہ پر لگی رہی تھیں۔ ایک ایک گراں لمحہ قطار باندھے اس کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔ اندر ہی اندر وہ تلملا کر رہ گئی۔ یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی کیا سارے مرد ایسے ہی ہر جائی ہوتے ہیں جو عورت کو اپنی لذت کا نشانہ بنادیتے ہیں جبکہ عورت اس کی کھیتی کو اپنے خون سے سینچ کر اُسے روحانیت اور فرض الٰہی کا درجہ دیتی ہے۔

اچانک دروازہ کھل گیا۔ اس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ سامنے ایک اجنبی آدمی تھکا تھکا بوجھل قدموں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ رسمی خیر و عافیت پوچھتے ہوئے ایک بند لفافہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور یہ کہتے ہوئے واپس نکل گیا۔

''آج صبح گھر پر معلوم پڑا۔ سیدھا یہاں چلا آیا۔ پرسوں ڈاک سے صاحب کی چھٹی آپکے نام آئی تھی''۔ یہ سوچ کر کہ دفتر کا کوئی نیا چپراسی ہے ، اس نے کانپتے ہاتھوں سے لفافہ چاک کر دیا۔ پڑھ کر وہ ایسی چونکی کہ ایک ایک لفظ اُسے کاٹ کھانے کو آنے لگا۔ اُسے ایسا جھٹکا لگا جیسے اس نے گیلے ہاتھ سے بجلی کے ننگے تار کو چھولیا ہو۔ اس کا کلیجہ منہ کو آرہا تھا۔ سانس رکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ یہ بات اس کے فہم و ادراک سے بالاتر تھی۔

وہ سکتہ میں آگئی۔ تھوڑی دیر تک نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑی رہی۔ چہرے پر اداسی کی لہر آتی اور چلی جاتی کہ اس کے اعصاب پر مسلط خاموشی کو اور گہرا کر دیا تھا۔ ماضی کے خشک پتوں کا ڈھیر بھول کر اب وہ مستقبل کو بھی ایک سنگلاخ سلسلہ اور روحانی عذاب کی بے آب و گیاہ وادی محسوس کرنے لگی۔

دہلی میں ایک مہینہ کا عرصہ گذرا تھا وہ شہر کے نامور ویدوں اور ڈاکٹروں کے پاس اُمید کا کشکول لے کر گئی تھی۔ لیکن ہر وید ڈاکٹر اس کی اداسی کا باعث بنا تھا۔ ہر چند روپیوں کی برسات کرتے ہوئے بھی کوئی الٹرا ساؤنڈ کرنے پر تیار نہ ہوا۔ قانون شکنی کے معاملے میں ہر

ایک نے حامی بھرنے سے انکار کر دیا۔ وہ اپنے خیالات کے جوہر کی تلاش میں بھٹکتی پھرتی رہی مگر جوہر کانسی کے کٹورے میں ملنے سے رہ گیا۔

بظاہر اُسے کوئی جسمانی تکلیف نہ تھی۔ البتہ اس کے دل میں ایک امنگ تھی۔ جو اس کے دل کو دیمک کی طرح چاٹ رہی تھی۔ کئی سالوں سے وہ کچے پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ اس کا خون نچوڑ رہا تھا۔ اس غرض سے وہ کوڑھی مریضہ کی طرح اسپتالوں اور شفاخانوں کا طواف کرتی رہی تھی۔

ایک دن شہر کی مشہور نرولا جسٹ ڈاکٹر آسیہ نے پہلی ملاقات میں ہی صاف صاف لفظوں میں سمجھاتے ہوئے صلح دی۔

''بہتر یہ ہے کہ تم اپنے میاں کو سمجھاؤ۔ تم جیسی عورتیں اُمید کے کچے دھاگوں کو تھامے ہوئے اجالے کی تلاش میں مہیب تاریکی میں ڈوب جاتی ہیں۔ تم پڑھی لکھی ہو۔ اتنا کچھ نہیں کر سکتی ہو۔''

ڈاکٹر کی بات کڑوی محسوس کرتی ہوئی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ یہ سوچ کر اس کے کلنک پر آ گئی تھی کہ وہ اسکی پریشانی کا مداوا کریگی کیونکہ ایسے معاملات میں وہ اپنی قابلیت سے سارے شہر میں ممتاز مانی جاتی تھی اب خالی ہاتھ واپس لوٹتے ہوئے رہ رہ کر اُس کی یہ بات یاد آ رہی تھی کہ

''لڑکا لڑکی کے معاملے میں ڈاکٹر کا کوئی دخل نہیں۔ اللہ کے سامنے سب کٹھ پتلی کے مانند بے بس و بے اختیار ہیں۔ صرف دعا کے اثر سے اُمید تک ٹمٹاتی لو دیر پا قائم رہ سکتی ہے۔''

یہ بات وہ کئی بار اپنے شوہر سے دہراتے دہراتے تھک چکی اُسے سمجھاتی۔ اوروں کی مثالیں دیتی۔ لیکن وہ اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہ آیا جیسے اس کی عقل پر کوئی وزنی پتھر پڑا تھا۔

زخم مندمل ہو گئے تھے۔ خیالات مجروح گو کہ دوسری بچی کی پیدائش پر وہ کسی پہاڑ کے نیچے دب گئی۔ نفرت کی شدت نے اس کے حواس گم کر دیئے اسے ایسا لگا کہ نرم گذار صوفے

سے اوندھے منہ زبروں پہاڑی کی یخ بستہ منجمند فضا میں جا گری ہو۔

اس کی حالت قدرے شوہر سے مختلف تھی۔ وہ خوبصورت اور معصوم دولڑکیوں کی ماں بن چکی تھی۔ اُسے ماں کا درجہ ملا تھا۔ قدرت کا ایک ایسا عطیہ......جس کی مہک پا کر ہی ایک انسان کا دل بغیر کسی ہچکچاہٹ کے سجدہ کرتا ہے اور دنیا عورت کی عظمت سے آشنا ہو جاتی ہے۔

ہونی کو کس نے ٹالا ہے۔

وقت دبے پاؤں کچھ اس طرح گذرا کہ اسکی آہٹ تک نہ ہوئی۔ رفتہ رفتہ ان دونوں میں کسی حد تک کچھاؤ سا پیدا ہونے لگا۔ نفرت بھرے جملوں نے اس کی زندگی میں ایک ایسی خلیج پیدا کردی۔ جسے پاٹنا اس کے بس میں نہ تھا۔ جیسے اسکی کوکھ سے ناگنوں نے جنم لیا ہو۔

"بیٹے کے بغیر کوئی زندگی مکمل ہے۔" شوہر کی کرخت آواز سماعت سے ٹکرائی۔

"جنہیں بیٹا نہیں ہے۔ کیا وہ زندہ نہیں رہتے ؟۔" وہ اُسے سمجھاتے ہوئے بولی۔

"تم عورتیں بے وقوف ہوتی ہو۔ مرد کو اپنا جانشین اور وارث ہونا چاہیئے۔

"یہ ضروری نہیں ہے لڑکی لڑکے سے کم تر درجہ رکھتی ہے۔ البتہ اچھی تعلیم و تربیت ضروری ہے۔"

"مجھے ان غیر ضروری باتوں سے کوئی سروکار نہیں۔ دراصل تم اس قابل نہیں رہی۔"

"تمھیں کیا ہو گیا ہے۔ آج بہکی بہکی باتیں کرنے لگے ہو۔"

"کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔ اب مجھے عورت ذات سے نفرت سی ہو گئی ہے۔"

اس نے اس کی زندگی میں زہر گھول دیا۔ وہ شوہر کی بے تکی باتوں پر سسکتی رہی۔

وقت گزرتا گیا......

اب وہ ہمیشہ اس تاک میں لگا رہتا۔ عورت کے خلاف کچھ نہ کچھ اُگل دے۔ اس کے نام پر اوٹ پٹانگ گالیاں دیتا رہتا۔ جیسے خود اس نے عورت ذات سے نہیں، ایودھیا کی کسی

بوسیدہ اور ٹوٹی ہوئی مورتی سے جنم لیا ہو۔

وقت گزرتا رہا......اپنے پیچھے گھسے پٹے نشانات چھوڑتا رہا۔

مرد کی ہمیشہ سے یہ خواہش رہی ہے کہ ہر بار وہ اپنی عیاری اور چاپلوسی سے عورت سے بات منوائے۔ اپنی باتوں سے ورغلاتا رہے۔ اپنی انا اور شہوت کی خاطر حیوانیت کے بوتے پر رات کے اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر دست درازی پر اتر آتا ہے۔ جی بھر نہ آیا تو جنسی جنوں میں بازاری رنڈیوں کے دام میں چلا جاتا ہے۔ کئی بار اس نے ایسا کرتے ہوئے اپنی دلچسپی ظاہر کر کے اس بات کا ثبوت دے دیا گویا گائے گھر میں ہوتے ہوئے گوالے کی گائیوں کے پیچھے پڑ گیا۔

پھر ایک دن کچھ ایسا ہوا۔

وہ اس کے بہکاوے میں آگئی عورت ذات تھی۔ جذبات مجروح ہوتے ہوئے بھی اس کی چاہت پوری کردی۔ ورنہ اس معاملے میں اس کے رویہ کو دیکھتے ہوئے اس نے قسم کھائی تھی جب تک وہ بُرے اطوار سے باز نہ آئے گا وہ اس کے پاس نہیں ٹھپکے گی

بھلا وقت سے کیا ساجھے داری! یہ چپکے چپکے سے ہاتھوں سے ایسا نکلتا ہے کہ کانوں کان کہ خبر نہیں رہتی۔ وہ تذبذب کی شکار ہوگئی تھی۔ کسی الجھن میں ڈوبی نت نئے اندیشوں میں گھیری اُسے ہر سو تاریکی ہی تاریکی نظر آرہی تھی۔ پھر وہی خوف کی کیفیت اس کے وجود میں جیسے کپکپاہٹ پیدا کر رہی تھی۔ وہ آنے والے لمحوں کے ادراک سے کانپ اٹھتی تھی۔

وہ شہر کے اچھے اچھے ڈاکٹروں سے معائینہ کرانے کے لئے سرکاری اور نجی اسپتالوں میں بھکارن جیسی بھٹکتی رہی۔ فقیروں، درویشوں اور آستانوں میں نذر و نیاز چڑھاتی رہی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ بے جان قبروں پر جانا اچھا نہیں۔ اور کسی کے سامنے دست سوال پھیلانا اچھی بات نہیں۔

وہ راتوں کو بے چین و بے قرار رہتی۔ سوتے میں بھی سسکیاں لیتی رہتی۔ وقت پر

پانچ نمازوں کوادا کرتی۔اب سجدوں میں پہلے سے زیادہ طوالت رہتی۔آنکھوں میں آنسوؤں اورلبوں پر التجائیں اوردعائیں رہتی۔

اس باراس کے دل میں وہی تمنا اور آرزو کی خلش پیدا ہوگئی تھی۔جس کی دبی دبی سی خواہش کئی سالوں کے دل میں تھی۔جس کے اظہار کرنے کو وہ اپنے شوہر کے سامنے جرات وتاب نہ لاسکی۔عورت ذات پر یقین رکھتی تھی۔

اس کے جسم وجان پر کیا بیت رہی تھی۔روح بدن سے نکلتی ہوئی دل ودماغ سن سا ہو جاتا تھا۔ان دیکھا دردِدل اندر ہی اندر کاٹ رہا ہوتا۔ایک ہنستا کھیلتا پھول جیسے بیٹے کی چاہت جو تھی۔

اس کا جسم ٹھنڈ سے بھیگا ہوا تھا۔ہاتھ میں لفافہ منہ چڑا رہا تھا۔جس نے اس کی سوچ کو ہتھوڑا مار مار کرادھ موا کردیا تھا۔اس کے تن من میں آگ لگی۔توعیسیٰؑ کی جگہ اپنے آپ کو سولی پر کھڑا بے بالکل بے دست پا سمجھنے لگی۔

دفعتاً سامنے پالنا میں بچہ رونے لگا۔پھر ہلکی ہلکی آواز میں سسکیاں لیتا رہا۔جس نے کمرے کے بوجھل ماحول کو مزید پر اسرار بنادیا۔آہستہ آہستہ رونے کی آواز اس کی سماعت پر حاوی ہونے لگی۔تو وہ غم واندوہ کے خول سے باہر آنے کی کوشش کرنے لگی۔

دیکھتے ہی تلملا کر اٹھی۔جیسے دل کو لگی آری چیر کر نکل گئی ہو۔شفقت بھری ممتا نے بھر پور انگڑائی لی۔

ایک ٹک دیکھتے ہوئے اس نے دل کے دروازے وا کردیئے۔اس نے بچے کو اپنے بازوں میں اٹھا کر آسمان کی طرف تشکر بھری نگاہ کی۔"بے شک!اے مولا۔تو بڑا کارساز ہے۔"
کہتے ہوئے اس نے بچے کو چوم کر گلے سے لگالیا۔ماں کی خوشی دیدنی تھی۔اس طرح آنکھوں سے آنسوؤں کے قطروں کو روک نہ سکی جو چہرے سے اتر کر بچے کے دامن کو بھگو رہے تھے۔

نفرت سے ہونٹ سکوڑتے ہوئے اس نے خط کو مروڑ کر کھڑکی کے باہر پھینک دیا۔ گویا بستر پر برسوں سے پڑے، کسی ادھ مرے سانپ کی آخری رسومات انجام دے گئی ہو۔

کھڑکی کے پٹ پر جو بلبل تھا۔ وہ بھی اب وہاں سے اڑ گیا تھا۔

اسکی کوکھ سے ایک خوبصورت اور تندرست بیٹے نے جنم لیا تھا۔ اس نے وفود جذبات سے دل میں کہا"۔ اے خالق کائنات! تیرا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے۔"

مگر اگلے ہی پل اس احساس نے اسے غم زدہ کر دیا کہ آج اُسے بیٹا کہنے والا کوسوں دور ہے۔ ایک بیٹے کی خواہش میں عورت ذات کی تذلیل کرنے والا ایڈس کا شکار ہو کر بمبئی کے کسی اسپتال میں زندگی کی آخری سانسیں گن رہا تھا۔

"اے کاش! ایسا نہ ہوا ہوتا۔"

اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ آیا۔ مگر اس نے انہیں روکنے کی بالکل کوشش نہیں کی۔

......................☆☆☆......................

پیر بابا

دور سے دیکھتے ہی اس بات کا پتہ لگ جاتا کہ وہ صاحب کشف وکرامات اور کمال درجے کا فقیر صفت تھا۔ اس کی عمر یہی کوئی چالیس پنتالیس سال کی رہی ہوگی۔ ہر وقت اسکے جسم پر سفید اجلی ڈھیلی ڈھالی قمیض جو ٹخنوں تک لمبی ہوتی اور ٹانگوں میں موری دار شلوار جھولتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ قمیض کے اوپر سیاہ رنگ کی واسکٹ زیب تن کیئے رہتا تھا اور دائیں ہاتھ میں ایک لمبی تسبیح کے دانے پھیر پھیر کر ہو اللہ ہو اللہ کا وظیفہ جپتا رہتا۔ چہرے پر لمبی گھنی ڈاڑھی اور سر سے سیاہ گھونگھریالے بال شانوں تک لہراتے۔ آنکھیں کسی خرگوش کی مانند چمکدار تھیں۔ بستی میں ہر کوئی اُسے پیر بابا کے نام سے پکارتا تھا...... اور وہ بڑی عقیدت اور توقیر واحترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔

بستی سے باہر وہ ایک بوسیدہ ویرانی جھونپڑی میں اپنا ڈیرہ جمائے بیٹھا تھا، کسی زمانے میں یہاں ایک پنچایت گھر ہوا کرتا تھا۔ جہاں گاؤں کا سرپنچ لوگوں کے باہمی تنازعوں کا تصفیہ کیا کرتا تھا۔ نیا زمانہ آیا تو سب معاملات کورٹ کچہری میں طے کیئے جاتے ہیں۔ پھر بھی انسان کی سوچ دھری کی دھری رہ گئی ہے۔

شام جب بھیگی بھیگی آنکھیں لیئے مغرب کی باہوں میں اتر جاتی اور سرد خنک ہوائیں چلنے لگتیں۔ باہر آنگن میں بوڑھے چنار درخت کے نیچے پڑی کھاٹ سے وہ اٹھ کر سیدھے جھونپڑی کے اندر چلا جاتا۔ دن بھر وہاں مراقبے میں بیٹھے بیٹھے اُسکا بدن تھک کر چور ہو جاتا۔ جسم کا ایک ایک انگ نڈھال اور بے جان پڑا محسوس کرتا۔ تب اُسے اپنی بوجھل پلکوں پر نیند کے زور کا احساس ہوتا۔ تو وہ اپنی خلوت گاہ میں پلنگ پر دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیتا تھا اور اپنے جسم کے اوپر لحاف اوڑھ لیتا۔ پھر تھوڑے وقفہ بعد وہ دنیا ومافیہا سے بے خبر ہو جاتا......

رحیم شیخ اس سمے تک اس کا انتظار کرتا رہتا۔ جب وہ اشارتاً اور ارادتاً بھانپ لیتا۔

وہ لوگوں کے قطار در قطار سروں کے اوپر پھلانگتا ہوا اسکے پیچھے پیچھے ہو لیتا۔ بڑی دیر تک پیر بابا کے پاؤں دابتا رہتا۔ یہاں تک کہ وہ نیند میں زور زور سے خراٹے لینا شروع کر دیتا۔

دن بھر ہمیشہ یہاں بستی کے آس پاس کے علاقوں سے لوگوں کا ایسا رش لگا رہتا کہ تل دھرنے کو جگہ نہیں رہتی۔ خصوصاً ان میں زیادہ تر اسکول و کالج کے زیر تعلیم لڑکے ولڑکیوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی۔ جو امتحانات میں اچھے نمبرات حاصل کرنے یا جذبہ عشق میں لیلی مجنون بنے وصل یار چاہتے تھے۔ کئی عورتیں ساس وسسر اور شوہر ونند کی زیادتیوں سے تنگ آکر اپنا رونا روتیں............ کئی ان پڑھ اور گنوار دیہاتی رزق کشائی کے طلب گار اور بے کار نوجوان نوکری کی خواہش میں سجدہ ریز نظر آتے تھے۔ غرض کہنے والے کہتے پیر بابا کی دعا کے لئے ترستے ہی رہ جاتے تھے۔

پیر بابا جس جھونپڑی میں رہ رہا تھا۔ اس سے لگ کر اُس نے ایک بڑا ٹین شیڈ بنوایا تھا۔ جو وہاں لنگر کے کام دیتا تھا۔ لوگوں کی اپنے ساتھ لائی ہوئی چیزیں کھانڈ، روٹی، چاول سبزی وترکاری پکانے کے کام آتیں۔ دن بھر گرم گرم قہوہ اور چائے سے تواضع کی جاتی۔ مفت میں دو وقت کا کھانا کھانے کا انتظام بھی تھا۔ اس انتظام کا کرتا دھرتا رجب شیخ تھا۔ ادھر نوری کی آمد بھی سونے پر سہاگہ تھی جب سے اس نے لنگر کے کام کاج میں اپنا ہاتھ بٹایا تھا۔

یہاں ہر جمعرات محفل سماع۔ سامعین کے دل میں ہلچل مچا دیتی تھی۔ دور دراز علاقوں سے ساز وسنطور طبلہ اور سارنگی بجانے والے نئی نئی دھنوں پر کشمیری گیتوں اور نغموں کا مظاہرہ کرتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ چلم بھر کر تمباکو اور گانجے کی ساجھی داری میں موسیقی کا ایسا سماں بندھتا کہ سننے والے پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی۔ غرض صبح ہونے تک وہاں دھوم مچا کرتی تھی۔

رجب شیخ بستی کے ایک نواحی علاقہ میں خاکروب تھا۔ سڑکوں اور نالیوں میں جھاڑو دینا اور صفائی کرنا اسکا پیشہ تھا۔ ایمانداری سے اپنا کام نپٹا کر ہر روز پیر بابا کے ہاں چلا آتا تھا۔

گو اسکی عمر کوئی پچاس سال سے زیادہ نہیں تھی مگر اسکے دل کے اندر کسی کمی کا احساس جاگ پانے پر ایک آگ سی بھڑ کنے لگتی تھی۔ پانچ سال پہلے اسکی بیوی اُسے داغ مفارقت دے گئی تھی۔ اب وہ اس غم کو مٹانے اور دل کو بہلانے کے لئے پیر بابا کی خدمت میں وقت گزاری کرتا رہتا۔ اُسے ایک انوکھے خواب نے جگائے رکھا تھا۔

لوگ اُسے پیر بابا کے خاص مریدوں میں شمار کرتے تھے۔ دراصل وہ اسکے یہاں چھوٹے موٹے کام کرتا تھا۔ کئی بڑے آفیسراں بھی مقلدوں میں شامل تھے بوقت ضرورت رجب شیخ کی وساطت سے ضروری کام نپٹایا جاتا۔ گویا وہ پیر بابا اور حکومت کے اہلکاروں کے درمیان پُل کا کام دیتا تھا۔

رجب شیخ کی اسوقت حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ جب وہ کئی بار پیر بابا کے کان خرگوش کی مانند کھڑے ہوتے ہوئے دیکھ لیتا تھا۔ کئی نوجوان لڑکے، لڑکیاں اپنی پریم کہانی سناتے اپنی بے بسی اور لاچاری کا اظہار کرتے اور وصال صنم کی التجا کرتے۔ رو رو کے اسکے پیر پکڑ لیتے۔ زہر کھالینے یا خودکشی کرنے کی دھمکیوں سے اُسے مرعوب کر رہے ہوتے۔ بڑے دھیان سے پیر بابا انکی ایک ایک بات سن لیتا اور ایک جذبہ...... کے تحت اپنے ہاتھوں سے ان کے ملائم خوبصورت چہرے پر ڈھلک آئے ہوئے آنسو صاف کرتے اظہار تاسف میں انہیں سمجھانے لگتا......

''غم نہ کر۔ محبت اللہ تعالیٰ کا پاک وصف جذبہ ہے وہ ہمیشہ بندوں سے محبت کرتا آیا ہے اور محبت کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ کیا ماں باپ اپنے بچوں سے پیار و محبت نہیں کرتے اور بچے ماں باپ سے...... ہر کسی دل میں محبت کا جذبہ ہونا چاہیئے ۔ مرد عورت سے یا عورت مرد سے محبت کا اظہار کرے تو اس میں برائی کیا ہے۔ دیکھتے نہیں۔ حضرت آدمؑ کو حضرت حواؑ کی محبت کی خاطر جنت چھوڑنا پڑی تھی۔''

رجب شیخ سارا ماجرا دیکھتا اور سنتا رہتا اور ہونقوں کی طرح ہکا بکا سا پیر بابا کے چہرے کو دیکھتا رہتا۔ اسکی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اسکے سینے میں طوفان اٹھتے تھے پھر اچانک اسکے

دل میں گدگدی سی پیدا ہو جاتی جو رفتہ رفتہ ایک دبی سی چنگاری کی شکل اختیار کر لیتی ۔ آگ کی لپٹیں اٹھنے لگتیں تو اُسے سارا بدن سلگتا محسوس ہوتا ۔ کبھی یوں ہوتا ۔ کہ اسے آنکھوں کے سامنے کسی کی پھیکی پھیکی سی مسکان لئے ہونٹ دکھائی دیتے ۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ ان ہی خیالوں میں گم ہونا چاہتا تھا ۔ جہاں ان دونوں کے سوا کوئی تیسرا موجود نہ ہو ۔

کتنی عجیب بات تھی ۔ جس علاقہ میں رجب شیخ کی ڈیوٹی تھی اس سے لگ کر دوسرا محلّہ پڑتا تھا ۔ نوری نام کی مہترانی اس محلے میں تعینات تھی ۔ بے حد حسین تھی ۔ گوری چٹی جوان عورت ۔ مگر اسکی بدقسمتی یہ رہی کہ ابھی وہ پہلا بچہ ہی پیدا کر چکی کہ اس کا خصم ایک سڑک حادثے کا شکار ہو گیا تھا ۔ اب بچہ اور اپنا پیٹ پالنے کا سوال تھا اُسے سڑکوں پر جھاڑو دیئے ۔ بغیر کوئی سہارا نہ رہا ۔ وہ مضبوط ارادہ کی عورت تھی اور قسمت کی ٹھکرائی ہوئی اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی ہے ۔ لگ بھگ اسوقت عمر یہی چالیس سال کی ہوگی پھر بھی اس کا بدن کسا ہوا تھا ۔ چہرہ دلکش اور آنکھوں میں ایک چمک سی تھی ......

موجودہ دور میں کسی عورت کے جسم کے نقوش اور سینے کے اُبھار کو دلکش جاذب نظر دیکھتے ہی آوارہ اور لفنگے نوجوانوں کے منہ سے رال ٹپکتی نظر آتی ہے ۔ اس میدان میں کئی بوڑھے لوگ بھی ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کر نوری کو اپنے بس میں کرنا چاہتے تھے ۔ اکثر اوقات گندے فقرے کسنے والوں اور بُرے اداروں کی زد میں آ کر تلملا کر رہ جاتی ۔ گیلی صابن ٹکیہ کی طرح اپنے آپ کو بچائی رہتی اور انکے چنگل سے باہر نکل جاتی ۔ وہ ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ جاتے ۔

اس سلسلے میں رجب شیخ کی کیا اوقات ...... اُس نے لاکھ جتن کیئے ۔ کئی بار اُسے شیشے میں اتارنے کی کوشش کی ۔ چھوٹی موٹی رقم کا لالچ دیتا رہا ۔ اپنا کام نپٹا کر اسکے علاقہ میں جھاڑو دیتا رہا ۔ غرض جتنا اس سے سیس ممکن ہو سکتا تھا ۔ کسی قسم کی کسر باقی نہ چھوڑ دیتا ۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی ۔ ہنسی مذاق میں ٹال دیتی اور کبھی گھاس نہ ڈالتی ۔

اس درمیان ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔ اچانک وارڈ آفیسر کا تبادلہ ہوگیا۔ اسکے متعلق بتایا جاتا تھا کہ وہ اپنی ڈیوٹی کا پابند تھا مگر رشوت خور بھی تھا۔ اپنے ماتحتوں کو تنگ کر کے پیسہ بٹورنا اس نے اپنا پیشہ بنالیا تھا۔

پہلی بار جب اس نے نوری کو دیکھا تو وہ دیکھتا ہی رہ گیا۔ آج تک اُسے اپنی ڈیوٹی کے دوران ایسی خوب صورت مہترانی کو دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ دل میں جذبات بھڑکتے ہی اسکی جانب چلا گیا اور اُسے دیکھنے کے لئے آنکھیں ترسنے لگتیں۔ اب وہ دن میں کئی بار علاقہ کا چکر کاٹتا رہتا۔ شاید اسکے شباب کی چنگاریوں میں بھسم ہو جانا چاہتا ہو۔ لیکن نوری ہمیشہ مچھلی جیسی اسکے ہاتھوں سے پھلستی جاتی تھی ۔ یہ سب وہ برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ پھر انتقام کے جذبہ میں آکر اس نے نوری کا تبادلہ دوسری جگہ کرادیا۔ جو یہاں سے کافی دور تھا۔ آنے جانے کا وقت اور بس خرچہ کی لاگت سوچتے سوچتے نوری کا بُرا حال ہوگیا تھا۔ لیکن اس آڑے وقت میں رجب شیخ نے ایسا کمال کر دکھایا کہ جمعدار کی زندگی میں ایک بھونچال سا آگیا۔ دوسرے دن وہ پیر بابا کے توسط سے نہ صرف آڈر کو منسوخ کرانے میں کامیاب ہوگیا بلکہ جمعدار کو جیسے مکھن سے بال کی طرح باہر نکال کر اُسے کسی دور دراز علاقہ میں تعینات کرادیا۔

ایک طوفان آیا تھا جو گذر گیا۔ نوری کسی پیڑ سے ٹوٹی ٹہنی کی طرح رجب شیخ کی بانہوں میں آکر گر پڑی۔ لیکن گرتے گرتے اس نے پیڑ سے ناطہ توڑنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ صرف میٹھے میٹھے بول سے خوش کرتی رہتی۔ اس کا دل لبھاتی رہتی۔

پل دو پل کے لئے اس کا ماتھا ٹھنکنے لگتا۔ اُسے نوری کی قربت حاصل ہونیکی اُمید موہوم سی دکھائی دینے لگتی۔ ساری کوششیں رائیگان ہوتی نظر آتیں۔

وہ اسکی بے اعتنائی کا بدلہ لینے کے بارے میں سوچتا رہتا مگر اسکے دل کے تہہ خانوں سے کوئی کسک اٹھتی جو اُسے ایسا کرنے سے روک لینا چاہتی تھی۔

ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ دہشت گردوں نے اپنا جال بچھائے رکھا تھا۔ آئے دن ہو

رہے گرینڈ دھماکوں اور فائرنگ نے لوگوں کی زندگی اجیرن بنا رکھی تھی۔ اور اس کا سارا خمیازہ بے گناہ شہریوں کو بھگتنا پڑتا تھا۔ اتفاق سے نوری کے چودہ سالہ بیٹے کو پریس نے قربانی کا بکرا بنالیا۔ شام کا وقت تھا۔ کارخانہ سے گھر آتے آتے گھنٹہ گھر کے قریب گذرتے ہوئے اُسے دھر لیا گیا۔ اس پر گرینڈ پھینکنے کا فرد جرم عائد کی گئی...... وہ سلاخوں کے پیچھے زیر حراست تفتیش میں موت اور زندگی کے درمیان سانسیں گنتا رہا۔

ادھر نوری کی دنیا لٹ چکی تھی رجب شیخ خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ اسکے دل کے اندر شگوفے پھوٹنے لگے تھے۔ ایک اچھا موقع ہاتھ آیا نوری کو زیر کرنے کا............

دوسرے دن وہ نوری کو اپنے سنگ پیر بابا کے چرنوں میں لے آیا۔ جونہی پیر بابا کی نظریں اسکے کتابی چہرے پر پڑیں۔ اسکی زندگی میں بھونچال سا آ گیا۔ چہرے کی بجلیاں اسکے جسم کو بھسم کرتی رہیں۔ شانوں پر بل کھائے ناگن کی طرح ڈستے ہوئے بال دیکھ کر بس وہ اپنا ہوش کھو بیٹھا۔

اِدھر کچھ دیر تک نوری مبہوت بنی ہاتھ جوڑتے آنسو بہاتی رہی۔ اس دوران پیر بابا کسی گہری سوچ میں غرق ہو گیا تھا۔ پھر یکبار اللہ ہو اللہ کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ چند لمحوں تک آسمان کی جانب نظریں دوڑائیں ایک لمحہ پتھر کی سِل جیسا ساکت ہوا۔ پھر دھڑم سے نیچے آ کر گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائی۔ نوری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

"نوری فکر نہ کر۔ تیرے لڑکے کو کچھ نہ ہوگا...... تھوڑا سا صبر سے کام لے......" یہ کہتے ہوئے وہ خاموش ہو گیا۔ دائیں بائیں نظریں گھمائیں۔ پھر پلکیں گرا دیں۔ رک رک کر سمجھاتے ہوئے دوبارہ کہنے لگا۔ 'ہم اپنے موڈ کے مطابق چلہ کشی کریں گے۔ اس وقت آگ میں لوبان ڈالنے تمہیں حاضر رہنا ہوگا۔"

رجب شیخ سے رہا نہیں گیا اور وہ اسکے پیر پکڑتے ہوئے عاجزی سے بول پڑا۔

"بابا۔! نوری بہت اچھی عورت ہے۔ دل سے بھلی ہے مگر قسمت کی ستائی ہوئی ہے۔

کچھ ایسا چمتکار کرو بابا کہ اس کا بیٹا رہا ہو جائے۔"

"ہاں! ہاں!...... کب وہ گھر لوٹ آئیگا۔ بابا۔" نوری نے پہلی بار زبان کھولی اسکے بعد رجب شیخ نے مداخلت کی۔

"باولی کہیں کی! تم بیچ میں کیوں اپنی ٹانگ اڑا دیتی ہو۔ کہا نا جلدی گھر لوٹ آجائے گا۔" "لیکن!...... لگ بھگ ایک مہینہ گزر گیا ہے۔"

"چپ رہ بوڑھے کھوسٹ...... اللہ ہو۔ اللہ ہو!" اچانک پیر بابا کا تیور بدلا اور رجب شیخ پر برس پڑا۔ اسکی حیرت کا ٹھکانہ نہ رہا۔ وہ جس مقصد کو لے کر نوری کو یہاں لایا تھا۔ اس کا بنا بنایا کھیل چوپٹ ہو گیا۔ اب اسکے پاس زہر کا گھونٹ پی لینے کے سوا کچھ چارہ نہ تھا۔

پچھلے چند دنوں میں رجب شیخ نے پیر بابا سے منت سماجت کرتے ہوئے مدد چاہی تھی۔ اپنے دل کی ایک ایک پیدا شدہ کیفیت بتائی تھی اور اپنی تنخواہ میں نصف سے زیادہ رقم ہدیہ کے طور پر پیش کی۔ غرض اس نے پیار جتانے کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی۔ لیکن بدلے میں یہ صلہ......؟ سارا ماحول بیابانی کا شکار ہو گیا تھا۔ وہ سوچتا رہا۔ "پیر بابا کا اپنا کیا جاتا اگر تھوڑی سی مروت بھرتا بات دیتا۔" "کیا سوچنے لگا ہے تو۔ مجھے اسکی سب خبر ہے۔ ہانڈی کو پکنے دے ذرا۔ لنگر میں کیا سبزی پکائی جاتی ہے۔ اُسے دیکھ کے آ...... کچھ دیر تک خاموش رہا پھر متانت لہجہ میں بولا" آج دوپہر کا کھانا نوری یہاں کھا کر ہی جائے گی......"

نجانے کیونکر رجب شیخ کے موٹے بھدے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سی نمودار ہوگئی۔ وہ یہ سمجھ پا رہا تھا کہ پیر بابا نے اسکے دل کا چور پکڑ لیا ہے اور اُسے مطلب کی بات اشارہ میں سمجھا دے۔ بے سوجھ اس نے اپنی عاقبت خراب کردی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اور نوری کو اپنے ساتھ لیکر لنگر خانہ میں بیٹھا کر الٹے قدموں لوٹ کر آگیا اور پیر بابا کے شانوں کو دباتے وقت غبارے کی طرح سکڑنے لگا۔ متانت بھرے لہجہ میں گویا ہوا۔

"بابا کچھ بھی کریں نوری کے دل میں میری محبت ڈال دیں۔ عمر بھر میں تیری سیوا

کرتا رہوں گا۔'' ''ارے پگلے نادان! یہ سب میں تیرے لئے ہی کر رہا ہوں۔ زیادہ اتاولا ہوا۔ تو گھاٹے میں رہے گا۔''

نوری پیر بابا کے پاس مسلسل آتی رہی۔ دھیرے دھیرے اُس نے لنگر خانے کا چارج سنبھال لیا۔ ساتھ ساتھ اس نے لنگر خانے اور آنگن میں صفائی اور جھاڑو دینے کی ذمہ داری اپنے اوپر واجب کر لی یہاں تک کہ پیر بابا نے اُسے کھلی چھوٹ دے رکھی تھی۔ اب وہ خلوت گاہ میں بستر بچھاتی اور اس کے کپڑے بھی دھویا کرتی۔

وقت کا پرندہ پرواز کرتا گیا۔ نوری کے بغیر یہاں کا سارا ماحول کاٹ کھانے کو دوڑتا۔ اس میں ایک بدلاؤ سا آ گیا۔ شاید اُسے یہ بھی یاد نہ ہوگا کہ اس کا ایک بیٹا بھی تھا۔ زندہ ہے یا مردہ۔ اُسے ان باتوں سے کوئی واسطہ نہ رہا۔ اُسے پیر بابا کے پاس رہنے سے ایک سکون ملتا تھا۔ باقی زندگی گزارنے کو اب تھوڑے دن رہ گئے۔ نجات پانے اور پچھلے گناہوں کا کفارہ کرنے کا واحد وسیلہ خیال کیا۔ اب پیر بابا اور لوگوں کی سیوا کرنا اس کا ایک ہی مقصد رہ گیا تھا۔

پہلے پہل رجب شیخ کو نوری کی موجودگی اچھی لگتی تھی۔ کانوں میں شہنائیاں بجنے لگتیں...... تھوڑے عرصہ بعد اسکی سوچ میں بھنور پڑنے لگے جب اُسے شہنائی بے سُری لگتی اور بدمزگی پیدا کرتی رہی۔ سامنے اپنے خوابوں کا محل ٹوٹتا بکھرتا نظر آ گیا۔ اسے نوری کے مزاج میں تبدیلی۔ خیالات میں تغیر اور سرد رویئے پر قلق ہوا۔ جیسے اسکے ساتھ زندگی اور موت کا رشتہ ختم ہو گیا۔

نوری اسکے دل و دماغ سے ریت کی صورت میں پھسلتی جا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ پیر بابا کی جھولی میں گرتی جا رہی تھی۔ یہ سب دیکھنا رجب شیخ برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ لیکن اسوقت رجب شیخ کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُسے ایک شناسا نے نوری کے بارے میں ایک دلخراش خبر سنائی۔ اسکے کہنے کے مطابق چند لوگوں نے نوری کو پیر بابا کی خلوت گاہ میں شانوں پر پھیلے بکھرے بال لئے صبح تڑکے نکلتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔

یہ بات ایک ایک کر کے بستی کے چند بزرگوں کے کانوں تک پھیل گئی۔ رجب شیخ زخمی شیر کی طرح تاک میں بیٹھا رنگے ہاتھوں پکڑنے کا خیال کرنے لگا۔ پیر بابا پہلے ہی اسکے شک کے دائرہ میں آ گیا تھا۔ یہ بات جلتی پر تیلی کا کام کر گئی......

دوسرے دن جب سورج نکل آیا۔ رجب شیخ ایک فوجی جرنیل کی طرح پیر بابا کی جھونپڑی کے باہر گھات لگا کر سراپا کھڑا تھا۔ ایک چھوٹی سی جمعیت اسکے گرد اکھٹی ہوئی تھی۔ وہ سب کافی مشتعل لگ رہے تھے۔ چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ پیڑ پودوں اور درختوں پر پرندے اپنے پروں میں اڑان لئے دُور دُور تک محو پردازی کی تیاری کر رہے تھے۔ ان سے الگ بوڑھا چنار درخت ساکت کھڑا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

بڑی دیر تک رجب شیخ بار بار گرجدار آواز میں دہاڑتا رہا۔ کبھی ڈھونگی بابا اور کبھی نوری کا نام لے کر پکارتا رہا۔ جھونپڑی کے اندر جا کر دیکھا۔ لیکن سوائے مایوسی کے وہاں اسکے ہاتھ میں کچھ نہ آیا۔ تھکے بوجھل قدم اٹھا کر بوڑھے چنار درخت کے قریب بڑبڑاتا رہا۔ سالا! ڈھونگی پیر رات کا فائدہ اٹھا کر نوری کو بھگانے میں کامیاب ہو گیا ہے......"

رجب شیخ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ بڑی دیر تک دور مغرب کی جانب اڑتے

پرندوں کے غول کو دیکھتا رہا۔ ایک تازہ دم جوڑی انکے پیچھے پیچھے چلی جا رہی تھی......!!!

کھو کھلی اُڑان

شام ڈھلنے کے بعد رات کی لمبی ہوئی باہنوں میں جب تمام شورشیں سمٹ جاتی ہیں تو میں برآمدے میں ایزل پر چڑھے ہوئے کینواس کی سفیدی پر اپنی حسرت بھری نظریں جمادیتا ہوں ''کیا میری نظریں میرے ارمانوں کی طرح پُر رنگ ہیں۔''

یہ سوال میں خود سے بار بار پوچھتا ہوں۔ جواب میں مجھے ذہنی اضطراب کے بغیر کچھ نہیں ملتا اور مجھے گردونواح ایزل پہ چڑھے کینواس کی سفیدی سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ میرا ذہنی خلفشار بڑھا رہا ہے۔

برآمدے میں چھوٹے چھوٹے بچے کھیل رہے ہیں۔ میں اپنی اُلجھن سے فرار ہوکر اپنے خول میں اُترنے کی سعی کر رہا ہوں ...... کیا میرا بچپنا ایک بار پھر مجھے گلے سے لگا سکتا ہے؟...... ''نہیں ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ گذرے ہوئے لمحات واپس لوٹ کے نہیں آسکتے۔ اگر ایسا ہوتا تو...... میں اُسے کیسے بُھلا سکتا ہوں۔''

وہ اکثر میرے پاس آیا کرتی تھی اور تب تک میرے پاس بیٹھی رہتی جب تک کہ چاروں طرف مہیب اندھیرے کی چادر نہ پھیل جاتی۔ اس کی ہنسی کے فوارے آج بھی میرے کانوں میں گونجتے ہیں۔ میں جب اس کی نشیلی آنکھوں میں اپنا عکس تلاش کرتا تو وہاں کئی سوالات آنسوؤں میں تیرتے نظر آتے۔ وہ ہر بار اپنے ہونٹوں کو سکوڑ لیتی جیسے کچھ کہنے سے گھبرا رہی ہو۔ اس کی اندرونی کشش میری روح کو جھنجھوڑتی۔ اس کی اذیت ناک خاموشی نے میرے فن کو جلا بخشی اور میں نے اس سیلاب سے محفوظ رہنے کے لئے رنگوں کا سہارا لیا۔ کافی جدوجہد کے بعد جب میں نے ذہن کی وسعتوں میں پنہاں تصویر کو مکمل کرلیا تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس کی جوانی بھی رقص میں آگئی۔ ایک ہرنی کی طرح وہ ایزل پر لٹکتی تصویر دیکھ کر اچھلی اور ایک عجیب جذبے سے سرشار ہوکر مسرور قہقہے لگانے لگی۔ اس کی خوشی نے

میرے اندر اس احساس کو جنم دیا کہ ایک ساکت مجسمہ کا اس طرح حرکت میں آنا ہی میرے فن کی معراج ہے۔ کیلنڈر کے صفحات اُلٹتے رہے۔ وقت کے دیو نے کروٹ بدلی۔ جس کی زد میں میرا وجود بُری طرح آکر مجروح ہو گیا۔ لاشعور میں خیالات سکڑ ہی گئے۔ ذہن کے آکاش پر آوارہ بادلوں کی طرح ارمان دم توڑتے رہے۔ سوچیں منتشر ہوئیں۔ سانسوں کی رفتار دھیمی پڑ گئی اور میری ذات میرے لئے ایک نقطہٗ بن کے رہ گئی......

"نہیں نہیں...... میں تمہارا بوجھ نہیں اُٹھا سکتا۔ مجھے میرے حال پہ چھوڑ دو۔ میں اپنی زندگی کا بوجھ تنہا ڈھونا چاہتا ہوں۔ مجھے بھول جاؤ۔ بھول جاؤ مجھے...... مایوس لہجے کی یہ گونج آج بھی میری سماعت پر حاوی ہے۔

وقت کا پرندہ پرواز کر رہا ہے۔ برآمدے میں چھوٹے چھوٹے بچے کھیل رہے ہیں۔ ایزل پر چڑھے ہوئے کینواس کی سفیدی جیسے بے تاب ہے اور میرا فن کار گہری سوچ میں ڈوبا ہوا ہے۔ میرا ضمیر مجھ سے چلا چلا کر پوچھ رہا ہے۔

"انمول شاہکار کوڑیوں کے مول کیوں بکا؟۔ ایسا تو نے کیوں ہونے دیا؟"

مجھ سے کوئی جواب نہیں بن پایا۔ میں اپنا گلا دبانا چاہتا ہوں لیکن ایک تیز رفتار موٹر کار میرے شریر کو سڑک بنا کر میرے سر سے ٹکراتی ہے اور میں کانپ اُٹھتا ہوں۔

"نہیں نہیں ایسا نہ کہو۔ مجھے سے میرا فن نہ چھینو، رنگوں سے کھیلنے دو، ابھی مجھے اپنی روح کو رنگنا ہے، مجھے چھوڑ دو...... ہائے میرے بازو...... نہیں۔"

یہ چیخ میرے ارد گرد منڈلاتی ہے۔

بچے تھک کر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ چکے ہیں۔

رات کی بانہوں میں تمام شورش مٹ کے رہ گئی ہے۔ وقت کا پرندہ پرواز کر گیا ہے۔

ایزل پر چڑھے ہوئے کینواس کی سفیدی بے تاب ہے اور میرا فنکار نادم۔!

آئیڈیل

سٹاف ممبروں نے ایک چونکا دینے والی بات پر رائی کا پہاڑ بنا دیا۔ بات جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔

باس نے شہر کے کسی غیر معروف آرٹسٹ سے مہنگے دام پر ہٹلر کی تصویر پانچ ہزار میں منگوائی۔ بالکل انہونی سی بات سمجھ سے بالاتر تھی اُوروں کی نظر میں......

وہ تصویر عین باس کی کرسی کے عقبی دیوار کے اوپر آویزاں تھی کہ باہر سے آنے والوں کی نظریں سب سے پہلے ہٹلر کی تصویر پر ہی پڑا کرتی تھیں۔ نظر پڑتے ہی ذہن میں کوئی نہ کوئی بات ضرور اُبھرتی اور شک وشبہ زور پکڑنے لگتا۔ ہٹلر کے ظلم اور جارحیت کا تصور ذہنوں میں تادیر قائم رہتا۔ کئی دنوں تک افواہوں کا بازار گرم رہا۔

ہونا تو یہ تھا کہ کسی آرٹ گیلری سے مہاتما جی یا نہرو جی کی تصویر منگوا کر دیوار پر ٹانگی جاتی۔ ایسا ممکن نہ تھا تو اپنے ریاستی وزیر اعلیٰ کی تصویر یا کسی نامور شاعر کی مثلاً اقبال کے شاہین کو اسکی تصویر کے پس منظر میں پرواز کرتا دکھایا جاتا۔ ادب سے دلچسپی نہ تھی تو بہتر تھا کسی ٹورسٹ رزاٹ کے انتخاب میں کوئی خوبصوت scenery سینری حیرت میں ڈالتی۔ البتہ ہٹلر کی تصویر خلافِ توقع تھی۔

جوں جوں چہ میگوئیاں کا زور کم ہوا۔ ایک سوالیہ نشان پھر بھی باقی رہ گیا۔ کہ باس نے آخر ہٹلر ہی کو اپنا ہیرو بنا کر کیوں پیش کیا......؟

البتہ سیکریٹری کے اصرار اور اسکی رسائی سے اتنا معلوم پڑا کہ تصویر اسکے اندر ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا کئے ہوئی تھی۔

پھر یہ ہوا کہ ایک عرصہ کے بعد فیکٹری میں اس بات پر تہلکہ مچ گیا۔ مینجنگ بورڈ کے ممبران اسوقت حرکت میں آئے جب نئی بھرتی کے معاملے میں تمام قوانین کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس کے ریمارکس نے سبھوں کو تاؤ دلایا۔

ناراض ممبروں میں تشویش پیدا ہوئی تو اسے اپنا فیصلہ واپس لینے یا ترمیم کرنے کی مانگ بڑھنے لگی۔

وہ پتھر کی لکیر کی طرح اپنی ضد پر اڑا رہا۔

معمولی سی بات کو مضحکہ خیز نوعیت کی دریافت ہونے پر کئی دراز قد ورکروں کو بلا وجہ نوٹس دیئے بغیر جبری ریٹائرمنٹ کا فیصلہ ان میں ایک نقطہ بھی شامل تھا۔

فیکٹری کی حالت بگڑنے لگی شہرت و مقبولیت اور سالمیت میں مزید رخنہ پڑنے کا خطرہ لاحق ہوا۔ تب مجبوراً بورڈ کو اسکے خلاف ایک شاطرانہ چال چلنی پڑی۔

ممبراں بوڑ کی ایک خفیہ میٹنگ منعقد ہوئی۔ متفقہ طور پر تجویز کو بروئے عمل لایا گیا۔ دوسرے دن باس کے خلاف بدیشی ڈیلی گیشن کے ساتھ نازیبا سلوک کی پاداش میں استعفیٰ دینے کی مانگ کی گئی۔

بے ڈول اور پست قد کی وجہ سے مہمانوں کو بار بار گردن جھکانے کی پریشانی الگ بات تھی۔ ساتھ ساتھ غلط رپورٹنگ اور بات بات پر غصہ دلانے والی باتوں کے عمل کو سبھوں نے خلاف ادب سمجھا تبھی فیکٹری کے لاکھوں روپے کا آڈر منسوخ ہوکر خسارہ ہونے کا الزام بھی لگایا گیا۔

عنکبوت کی تار بنی ہوئی سازش میں بڑی آسانی کے ساتھ مکھی کو ایک نہ چلی۔ اس سازش کے آگے باس کی ایک نہ چلی...... مگر اُسے اس رویہ پر کوئی رنج نہ تھا۔ بچپن سے وہ قدم قدم پر تلخیوں کا گھونٹ پینے کا عادی تھا۔ وہ ہمیشہ میانہ چھوٹے قد کی وجہ سے لوگوں کی نظروں میں عجوبہ سا بنا رہا۔

وہ جانتا تھا۔ دراز قد آدمیوں کی نظر میں اونچی اونچی بلڈنگوں کے درمیان چھوٹی بلڈنگ کی موجودگی آنکھوں میں شہتیر جیسی کھٹکتی رہتی ہے۔ رہ رہ کر اس ناپ کو بڑھانے اور گھٹانے کی فکر میں وہ اپنے برابر قد والوں کو ترجیح دیتا رہا۔ لیکن اس بار اونچی اونچی دیواروں کے مقابلے میں وہ خود کو بچا نہ سکا۔

چھوٹے قد کے ہٹلر نے نازیوں کا خون بہایا تھا جسے تاریخ دھرا دھرا کر تھک چکی ہے اور وہ اپنی نظروں میں دراز قد لوگوں کو نازی سمجھ رہا تھا۔

اگلے دن ایک نئے باس کے آجانے پر اس تفرقہ کو ہمیشہ ہمیشہ لئے مٹا دیا گیا۔ اس کے بے ہودہ آئیڈل کو یکسر مسترد کر دیا گیا۔ اسطرح دراز قد لوگوں نے راحت اور چین کا سانس لیا۔

........☆☆☆.................

پرموشن

ڈرائینگ روم میں داخل ہوتے ہی اسکی آنکھیں چندھیا سی گئیں۔

سارا کمرہ برقی قمقموں سے منور تھا۔ دیواروں پر گلمرگ اور پہلگام کے بہتے ہوئے لدر نالہ کی پینٹنگ۔ فرش پر کشمیر قالین، جس پر نرم گدے صوفے قرینے سے سجے ہوئے تھے۔

اور کھڑکیوں پر رنگین پردے آویزن......

کمرے میں پھیلی ہوئی چینی سینٹ نتھنوں سے داخل ہوتے ہی اُسے لگا جیسے وہ کسی انجانے سے عطار کی دکان میں داخل ہوئی ہو، سامنے انور صوفے پر بیٹھا ایک تازہ میگزین کے اوراق الٹ رہا تھا۔ اسکی ذہنی کیفیت بھانپتے ہوئے شاطرانہ لہجہ میں بولا۔

"آیئے، آیئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"

انور نے اُسکا اچھے میزبان کی طرح خندہ پیشانی سے استقبال کیا اور حریص نظروں سے سر سے پاؤں تک بھرپور جائزہ لے کر سامنے خالی صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"مجھے مسز شرما نے بھیجا ہے۔" یہ سنکر اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ جسکا اظہار وہ کھل کر نہ سکا۔

"ہاں۔ہاں۔ وہ کل تمہارے شوہر کی پرموشن کی بات کر رہی تھی اور تمہارے متعلق مجھے بتا چکی ہے۔"

"جی!" "مسز آصف! تم بخوبی واقف ہو کہ اسوقت ملک میں نوکری کا ایک سنگین مسئلہ آن پڑا ہے۔ اسی قدر ان ڈیو Un-Due پرموشن دینا ذرا مشکل ہے۔ پھر بھی میری یہ کوشش رہے گی کہ مسٹر آصف کو جلد ترقی ملے۔

"میں بھی اُمید لیکر آئی ہوں۔"

''کوئی بات نہیں۔اطمینان رکھیئے۔''

''میں جانتی ہوں وہ سب''۔اچانک اسکے لہجے کی جھلاہٹ کافور ہوگئی۔اب اسکی آنکھوں میں سکون تھا اور اسکے لہجے میں بھی سکون تھا۔

پھر دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔کئی موضوع زیر بحث آئے۔ان پر تبصرے ہوتے رہے۔خصوصاً موجودہ فحش فلموں کے کئی سیکسی سین ڈسکس کیئے گئے۔بس وہ اسکے ساتھ گھل مل گئی جیسے ا ن کے درمیاں برسوں کی جان پہچان اور دوستی کے رشتے استوار اور قائم تھے۔

بار بار وہ شرارتی نظروں سے اسکے سفید مرمریں بازووں کو گھورتا جارہا تھا۔تیس برس کی پتلی کمزور اور تیکھے نقوش والی سلونی سی لڑکی از جدید ڈائزئن کی ایک قیمتی ساڑھی میں بڑی حسین وجمیل لگ رہی تھی۔ ننگے شانوں پر گھنے بال چھوڑ کر انگڑائی لیتے ہوئے میگزین کو کبھی کھولتی اور کبھی بند کردیتی......

جبکہ وہ اسکی ہر شوخی پر مسکراتا رہا۔جیسے سمندر کی لہروں میں کوئی عقاب پر پھیلائے مچھلی کو اپنے پنجوں میں داب لینا چاہتا ہو۔

اچانک برقی قمقمے یکے بعد دیگرے مدھم پڑ گئے ۔ چوڑیوں کے کھنکارنے کی صدا خاموش ہوگئی۔اکھڑی اکھڑی سانسوں کی آواز سنائی دے پڑی۔

لگ بھگ آدھ گھنٹے کے بعد جب رضیہ کمرے سے باہر نکلی ۔اسکے ہاتھ میں ہزار کا ایک نوٹ تھا۔ بالوں کی ایک الجھی سی لٹ ماتھے پر اور چہرے پر پسینے کے چند قطرے لرزاں......

جاتے جاتے اسکے کانوں میں انور کی بات دیر تک گونجتی رہی۔

میں مسٹر آصف کی سفارش ضرور کروں گا۔

...............☆☆☆...............

خیرات

کنڈیکٹر۔بس کے الگ الگ اسٹاپوں کا نام لیتا ہوا وہاں سے ہر راہ گیر کو اپنی طرف متوجہ کرر ہا تھا۔

بس سواریوں سے کھچا کھچ بھر گئی پھر بھی اُسے ان کی مجبوری کا کوئی احساس نہیں ہوا۔ ان کا اصرار بدستور بڑھتا گیا لیکن کنڈیکٹر نے ان کی بات ان سنی کر دی ٹس سے مس نہیں ہوا ۔

''بابو جی۔خدا کے نام پر کچھ تو دے۔وہ تیرا بھلا کرے گا۔''

وہ چونک پڑا۔ پلٹ کر دیکھا۔سامنے ایک بھکارن ہاتھ پھیلائے سراپا التجا بنی کھڑی تھی۔

''معاف کرنا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔

''کچھ تو دے۔ایک روپیہ کا سوال۔''

نجانے اس بار وہ کیونکر اُسے بغور دیکھنے لگا۔اُسے محسوس ہوا کہ اسکی آنکھوں میں بے پناہ مجبوری ہے چہرے پر لاچاری اور مایوسی کے ساتھ ساتھ آواز بھی گلوگیر تھی۔ جو اسکے رگ وپے میں سرائیت کر گئی۔

اُسے بھکارن کی حالت دیکھی نہیں گئی۔غریب غربی کی چادر میں پیوند لگا کے اس نے سینے کی جگہ آدھے سے زیادہ کھلی چھوڑ رکھی تھی۔ میلے پھٹے گندے کپڑوں میں جسم کا ایک ایک حصہ عریانیت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

وہ اتنا متاثر ہوا کہ پتلون کی جیب میں ہاتھ خود بخود چلا گیا۔ اٹھنی کا سکہ ہاتھ آیا۔ اسے گویا حاتم طائی کی قبر پر لات مار کر بھکارن کے ہاتھ میں تھما دیا۔

پچاس پیسے کا سکہ دیکھ کر بھکارن بھڑک اُٹھی۔ اپنا منہ بُرا سا بنا لیا اور واپس لوٹاتے ہوئے طنزیہ لہجہ میں بولی......

بابو جی۔ آجکل اسکی ٹافی بھی نہیں ملتی۔ لگتا ہے تم بھی اپنی طرح کا کوئی بندہ ہو۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے شرارت سے اپنی جیب سے ایک روپیہ نکال کر اسکی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

ویسے اسکی بات اتنی زیادہ غلط بھی نہ تھی۔

گیراج کی پھٹی میلی اور گندی وردی میں وہ ذات و پیشہ میں اُس جیسا ہی لگ رہا تھا۔

..................☆☆☆..................

اُسے شہر کا نامور معروف فزیشن سمجھا جاتا تھا۔ یوں کلنک پر روزرش لگا رہتا تھا۔ گام گام شہر شہر کے مریض تانگے، آٹو رکشا اور کاروں میں چلے آتے اور یہ یقین کر کے ایک نئی زندگی جینے کی آس لے کر جاتے۔

لیکن آج پہلی بار اچانک وہ پریشانی کے شکنجے میں آ کر ایک معمولی سی گتھی کو سلجھا نہیں پا رہا تھا اور نہ کوئی حتمی فیصلہ کر پا رہا تھا۔

احساس کے بگولے اٹھ کر ہوا میں تحلیل ہوتے رہے۔ جس سے مایوسی کی تاریک پھیلی چادر کی لپیٹ میں اپنے وجود کو پا کر وہ انگشت بدنداں ہو چکا تھا۔

اس کی سوچ مجروح تھی۔

تمام راستے مسدود دکھائی پڑ رہے تھے۔ اُمید کی ٹمٹماتی روشنی کی دھیمی کرن آخری ہچکی لے رہی تھی۔ اُسے ایسا لگ رہا تھا جیسے ہر بار اس کی سوچ کی اڑان کو کمرے کی چھت ایسا کرنے سے روک رہی ہے۔ جو بیچ کی دیوار کی طرح رکاوٹ بنی تھی۔ پر کٹے پرندہ کی طرح اسکی اڑان بے معنی ہو کر رہ جاتی۔

سامنے میز پر تین پرچیاں پڑی تھیں۔ پہلی پرچی کے بعد جب دوسری پرچی کی رپورٹ دیکھی تو پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔ ماتھے پر سلوٹیں مزید گہری ہوئیں۔ اسکی سوچ میں بھنور پڑنے لگے۔

چند لمحوں تک وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان پرچیوں کو دیکھتا رہا۔

پہلی پرچی کسی سرکاری اسپتال کے لیباریٹری کی یورین ٹیسٹ تھی جسمیں تیزابی

خاصیت کے ساتھ ساتھ Puss cell بہت اور علامت شوگر کے علاوہ تھوڑی سی مقدار ظاہر کی گئی تھی۔

دوسری پرچی جو ایک نجی مقامی لیبارٹری میں کمپیوٹر پر تیار کردہ رپورٹ تھی۔ جس میں بتایا گیا تھا کہ Puss cell کی مقدار بالکل تھوڑی سی ہے۔ البتہ وافر مقدار میں شوگر بتائی گئی تھی اور چار مہینے سے حاملہ بھی درج تھا۔

اس کا ذہین ماوف ہوگیا۔ وہ اپنے کئے پر پشیمان اور نادم تھا۔ دل ہی دل میں اپنے کو کوستا رہا۔ پچھتاتا رہا۔ کمیشن کے نام پر چند سکوں کے عوض وہ بک چکا تھا ڈاکٹر دیر تک چھت کو گھورتا رہا۔

تیسری پرچی تشخیصی نسخہ کی تھی۔ نئی دوا تجویز کر لینا مقصود تھا۔

وہ کافی دیر تک مریض کے چہرے پر اتار و چڑھاؤ دیکھتا رہا۔ چونکا دینے والی بات یہ تھی۔ سامنے سٹول پر کوئی مریض عورت نہیں۔ سینے اور دمہ کے امراض میں مبتلا ایک دبلا پتلا ضعیف ناتوان مرد تھا۔

..............☆☆☆..............

Bund Mothi say Bagha Parinda

Shiekh Bashir Ahmad
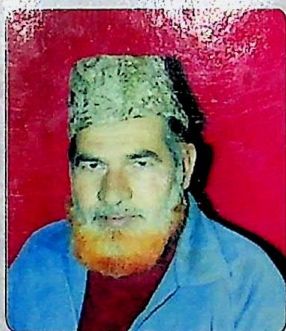
شیخ بشیر احمد کے افسانوں میں جہاں اپنے اطراف و اکناف کے باریک موضوع اپنی تمام تر وسعتوں کے ساتھ موجود ہوتے ہیں وہیں اُن کے افسانوی کردار احساس کے موم اور جنون کے پتھر سے تراشے ہوئے نظر آتے ہیں

شیخ بشیر نہ ابہام کے پیچھے بھاگتے ہیں اور نہ ہی استعارے اُن کا تعاقب کرتے ہیں۔ صداقتوں کے امین، صاف وشفاف لہجے کے مالک اپنے افسانوں کے کینواس پر متنوع قسم کے رنگ بکھیرنے والے شیخ بشیر کی تحریروں میں روانی ہے، روایت ہے، راستی ہے اور انفرادیت ہے

شیخ بشیر وادی کے اُن افسانہ نگاروں میں شامل ہیں جنہوں نے نامصائب حالات کے دوران بھی آبلہ پائی کے اس سفر میں اپنے شوق کا دامن تھامے رکھا اور ایک وسیع ادبی منظر نامے پر اپنا عکس اُبھارنے میں کامیاب رہے۔

افسانوی دنیا کے سفر میں اُن کے قلم میں دور تک نگاہ احساس دوڑانے کا فن جلوہ گر ہے

خدا اُنہیں اور وسعتوں سے نوازے

زاہد مختار